

سراجہ حبیبہ

سیرۃ النبیؐ



WWW.PAKSOCIETY.COM



سلاخہ جیبے



کی عقبی سمت نظر آگیا۔ شام کے دھندلے میں وہ کالی چادر کی ہل مارے ہوئے تھا، شدید سردی اور تیز ہوا کے ٹھنڈے جموں سے بچنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے چند لکڑیاں لگا کر اپنے ہاتھ تپ رہا تھا۔

بقا محمد نے کمر لگایا ہوئی آنے کی ڈھائی من ورنی پوری کو ایک پتھر نیک کرانی کمر سیدھی کی اور پھر غور سے اس کی طرف دیکھ۔ آگ کی ہلکی چمک سے چہرہ اور کانوں کی لومیں سرخ ہو رہی تھیں، ستواں ناک کے نیچے گھنی بھوری موٹھیں۔ اور گلابی ہونٹ بڑی بڑی چمک دار آنکھوں اور چہرے کی معصومیت نے ایک عجب قسم کی ہمدردی کے جذبات بقا محمد کے دل میں موجزن کر دیے۔

اوجھڑ عمر بقا محمد مرد ہوتے ہوئے بھی اس کے چہرے سے نظریں ہٹانے سے بے اختیار کمر لگے ہوئے بوجھ کو ایک

جانے کب؟ کہاں؟ اور کس وقت وہ اجنبی بڑی خاموشی کے ساتھ گل لالہ کی بیٹھک میں آن بیٹھ ہوا کہ ماسوائے بقا محمد کے کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

بڑی غلام رت تھی وہ کامیاب تھا اور شدید سردی کا عالم بارش اور برف باری کے بعد پیر پھال کا یہ اندر دینی پھاڑی سلسلہ کو سفید برف کی چادر اوڑھ کر بالی دنیا سے تقریباً کٹ چکا تھا۔ اونچے چیز کے درختوں سے لے کر نیچے چھٹی وادی تک ہر شے پر سفیدی کا عکس نمایاں تھا۔ چوتھ کے مقام سے لے کر وادی کے اس اندرونی حصے تک بہتا ہوا دریا ملغیانی کی زد میں تھا۔

مالی کی دکان سے نیچے تک جانے والی اکلوتی سڑک کا پشت ٹوٹ کر دریا نے پونچھ کی نذر ہو چکا تھا۔ لہذا بقا محمد کو آنے کی پوری اور لنگر تک پہنچاتے ہوئے اس کا ہیولہ درگاہ

مکمل ناول



طرف رکھ کر وہ اس کی سمت بڑھا۔
 "السلام علیکم بادشاہو۔" بقا محمد نے خوش دلی سے مسکرا کر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھایا۔
 اجنبی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ گویا کہ اسے اس قدر حسن سلوک کی قطعی امید نہ تھی۔ اس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کرتے ہوئے بقا محمد کو احساس ہوا کہ ہاتھ کی اس قدر تپش اس آگ کی حدت کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ وہ بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔ بقا محمد کے دل میں اندازے ہوئے ہمدردی کے جذبات گہرے ہو گئے۔
 "اوہو۔ بادشاہو۔" وہ قدرے گھبراہٹ سے بولا۔
 "آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ انھیں چلیں میرے ساتھ۔"
 اجنبی خاموشی سے بقا محمد کے ساتھ چل پڑا۔ آنے کی بوری کو اپنے ڈیرے کی دیوڑھی کے ساتھ رکھ کر وہ اجنبی کو ساتھ لیے ہوئے بارہ دوری سے متصل گل لالہ کی بیشک میں آگیا۔
 "آپ منہیں۔" بقا محمد نے کہا۔ "میں لپ لے کر آتا ہوں۔ یہاں بجلی اکثر غائب رہتی ہے۔" وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اجنبی ابھی تک کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔
 "آپ ابھی تک کمرے میں ہیں۔" بقا محمد نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 "بیٹھے کیوں نہیں بادشاہو؟"
 "میرے کپڑے کیلے ہیں۔"
 اجنبی نے پٹنگ کی سفید چادر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر بیٹھنے سے اس کے خراب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ بقا محمد نے اب بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ سپر ہیرا کے بادل ٹوٹ کر برے تھے۔ اور وادی میں زبردست جھل جھل چانے کے بعد گرہنے ہوئے وادی کی دوسری سمت چلے گئے تھے۔ بقا محمد اس کے قریب چلا آیا اور کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا۔
 "آپ کہاں لے باشندے ہیں؟"
 "اسی دھرتی کا۔" اجنبی نے جواباً کہا۔
 "مہاجر ہیں؟" بقا محمد نے سوال کیا۔
 "اپنے ایسے نصیب کہاں؟" وہ بجلی سی مسکراہٹ کے

ساتھ گویا ہوا۔
 "ہجرت تو پیغمبروں اور ولیوں کا مقدر ہوتی ہے۔ میں تو ایک عام سیاح ہوں۔ سیاحت کے شوق میں بھٹک کر ادھر آں نکلا۔ بس ذرا موسم اور حالات ٹھیک ہو جائیں کوچ کر جاؤں گا۔"
 اس کے آخری فقرے پر بقا محمد نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اور "میں ابھی آیا۔" کہہ کر ہر چلا گیا۔
 جب رات کا پہلا پیر شدید ٹھنڈک اور بگولوں جیسی دھند لیے ہوئے چیز کے درختوں سے نیچے اتر آیا تو اس ڈیرے کی مہمان نوازی کا نقشہ سامنے آچکا تھا۔ گل لالہ کا صاف و شفاف جوڑا اپنے نرم اونٹنی کھل و خود کے گرد لپیٹے ہوئے وہ اجنبی آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا اور سوار سے گلابی کشمیری چائے مک میں اندر لیتے ہوئے بقا محمد کہہ رہا تھا۔
 "کیا شان ہے جی ہمارے بڑے شادی کے ڈیرے کی۔ ابھی بہت سی قدریں سلامت ہیں یہاں۔ بہت سی دو اسکول چلتے ہیں۔ کئی یتیم بچوں کی پرورش ہوتی ہے۔ بیواؤں کے وظیفے مقرر ہیں۔ غرض یہ کہ غریبوں کی بہت ہے۔ یہ جگہ۔"
 "اس جگہ کا نام کیا ہے؟" اجنبی نے پوچھا۔
 "آزاد علاقے کا خطہ ہے جی۔" بقا محمد نے بتایا۔ "یہ علاقہ شاہ کوٹ کہلاتا ہے۔ بڑا شہر یہاں سے ڈھائی سو میل دور ہے۔"
 "شاہ کوٹ؟" اجنبی نے زیر لب دہرایا۔ اور پھر موضوع بدل کر کہنے لگا۔ "مہرانی بھالی صاحب! میں سونا چاہتا ہوں۔"
 "جی ضرور!" بقا محمد نے تابعداری سے کہا۔ "لیکن یہ بخار کی دوا ضرور لے لیں۔ صبح تک ان شاء اللہ آرام آجائے گا۔" اجنبی نے بیشک کا دروازہ بند کر لیا۔
 * * *
 شاہوں کی حویلی تک اس اجنبی کی آمد کی اطلاع شفقی کی زبانی پہنچی۔ جس نے اسے بتایا۔ "گل لالہ کی بیشک میں ایک مہمان آیا ہے؟"
 "کون ہے وہ؟" اس نے اپنی روایتی بے مروتی سے پوچھا۔

"کچھ صحیح معلوم نہیں۔" شفقی نے کہا۔ "بقا محمد نے بتایا ہے کہ کوئی سیاح ہے۔"
 "اچھا۔" کہہ کر شاہ بانو نے نظر کی سمت دیکھا۔ جہاں چلتے ہوئے آگ کے بلند شعلے اک عجیب و غریب منظر پیش کر رہے تھے۔
 "میں تو کہتا ہوں آپ! شفقی نے مونگ پھلی کھاتے ہوئے بات شروع کی۔ "گل لالہ تو ولایت سے اگلے ماہ واپس آئیں گے۔ لیکن شاہ لالہ کے آنے سے پہلے اسے واپس جانا ہو گا۔ ورنہ وہ تو قیامت برپا کر دیں گے۔"
 "ہاں۔" شاہ بانو نے گہری سانس لی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔"
 "اپنی ذات کے بادشاہ ہیں وہ۔ کب کسی کو برداشت کر سکتے ہیں۔"
 شاہ بانو نے ڈیرے اور حویلی سے ذرا فاصلے پر بنے ہوئے اونچے چوہارے کی طرف دیکھا۔ جس کی اونچی پیشانی پر نصب پتھر میں "شاہ ہاؤس" کے لفظ نمایاں نظر آرہے تھے۔
 "حویلی" ڈیرہ اور پھر "ہاؤس" شاہ کوٹ کے اندر اس درگاہ کی سلطنت پر راج کرتی ہوئی تین الگ الگ سوچ رکھنے والی نسلوں کی نشان دہی کرتی تھی۔ ڈیرے کے بزرگوں میں سے اب کوئی بھی حیات نہ تھا۔ اپنے وقتوں کے یہ لوگ اپنی عمر کی ساری فصل کاٹ لینے کے بعد نیچے قبرستان میں نحو خواب تھے۔ جب کہ حویلی کے اندر کی دنیا آباد تھی۔ اور "شاہ ہاؤس" کے کمین بڑے شاہ جی کے لاڈلے اکلوتے صاحبزادے صفدر حسین شاہ کو قسمت کے تھکتے ہوئے ستاروں نے بڑی زبردست بلندی عطا فرمائی تھی۔ اتنی بلندی کہ اکثر زمین ان کے قدموں تلے سے کھسک جاتی۔
 انہوں نے میزک پاس بتولی بی بی کو یکسر نظر انداز کرنے کے بعد اونچی سوسائٹی کی ایک خوبصورت خلی کو شریک حیات بنایا تھا۔ حالانکہ اس کے بعد انہوں نے تقریباً شاہ کوٹ سے نانا توڑ لیا تھا۔ لیکن دخل در معقولات کے طور پر وہ ہر ماہ یہاں ضرور تشریف لاتے اور تمام افراد کی زندگیوں پر فرداً فرداً تنقید فرمانے کے بعد درگاہ کے مجاور خاص نور محمد جہاں سے چڑھاؤ کی رقومات میں سے حساب کتاب کے بعد ایک معقول رقم اپنی جیب میں ڈال کر واپسی کا سفر اختیار کرتے۔ یہاں تک کہ کوئی بھی کسی قسم کا سوال نہ

کر سکتا۔ جب ان کی سرکاری گاڑی درگاہ شریف کا آخری موڑ مڑتی۔ تو ہر فرد اطمینان کی گہری سانس لے کر اپنے معمولات میں کھو جاتا۔
 ایسا کئی برسوں سے ہوتا چلا آ رہا تھا۔
 جب کہ گل زمان شاہ یعنی کہ گل لالہ بڑے شاہ صاحب کے بعد سرپرست اعلا ہونے کی حیثیت سے برائے نام اختیارات رکھتے تھے۔ صفدر حسین شاہ اپنی ہٹ دھرمی اور ضدی طبیعت کے باعث ان کی ایک نہ چلنے دیتے۔ دراصل گل لالہ "کشمیر کا ز" کے لیے کام کرتے تھے اور یہ عمل صفدر شاہ کو سخت ناگوار گزرتا۔ یہ الگ الگ نظریات اور مختلف سوچ کی بات تھی۔ دونوں کا خون ایک تھا لیکن راستے مختلف تھے۔ وادی کے اس پار کا ہر فرد جس نے ظلم کرنے والوں کو لٹکار کر ہاتھوں میں بندوق تھام کر جہاد کا اعلان کیا تھا۔ وہ فرد گل لالہ کی نظر میں مجاہد تھا۔ جب کہ صفدر شاہ یعنی شاہ لالہ کی زندگی میں اس کا تصور ایک بدبخت گرد کا تھا۔
 سوچ کے اس واضح فرق نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بے حد دور کر دیا تھا۔ چنانچہ جب صفدر شاہ تشریف لاتے تو گل لالہ قریبی قصبے میں دوستوں کے ہاں چلے جاتے۔ دریا کے دو متوازی کناروں کی طرح چلتے ہوئے یہ سفر جاری تھا۔
 البتہ نور محمد جہاں وہ واحد آدمی تھا۔ جو ان کے درمیان ایک پل کا کام دیتا تھا۔ بڑے شاہ صاحب کا یہ معتمد خاص قسم و فراست کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ وطن سے محبت کے ثبوت کے طور پر اس نے وطن کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنالیا تھا۔ اور وہ اس امر پر بے حد فخر محسوس کرتا تھا۔ وہ ایک دین دار اور دیانت دار انسان تھا۔ مالی کمی کی درگاہ سے حاصل شدہ آمدن کی ایک ایک پائی کا باقاعدہ حساب رکھتا۔ البتہ صفدر حسین شاہ کی سرکشی اسے بے بس کر دیتی۔ اور وہ خون کے آنسو پی کر رہ جاتا۔
 * * *
 تیسری رات جب بالکل غیر محسوس طریقے سے اجنبی مہمان کی طبیعت بگڑ گئی اور بقا محمد کے آڑموہ ٹوکوں نے بھی اثر کرنا چھوڑ دیا۔ تو بقا محمد اپنی جوتی دیوڑھی کے باہر اتار کر ننگے پاؤں شاہ بانو کے کمرے کے دروازے پر آکر رک گیا۔

زرد بلب لگے نخل لپ کے نیچے رکھی موٹی سی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے شاہ بانو باہر کی دنیا سے بے خبر تھی۔ اس کے فائنل امتحان ہونے والے تھے اور وہ محض تیاری کی خاطر ہاسٹل سے گھر چلی آئی تھی۔ وہ میڈیکل کی طالبہ تھی۔

بقا محمد نے سمجھنا کھار کر گلا صاف کیا۔ یہ شاہ بانو کو متوجہ کرنے کی کوشش تھی۔ شاہ بانو نے سر اٹھایا۔ وہ سمجھی کہ بقا محمد اس کے لیے کوئی پیغام لایا ہے یا پھر بتول نے اسے کسی ضرورت کے تحت بلایا ہے۔ لیکن بقا محمد کی فریاد اسے حیران کر گئی۔

”وہ اس وقت سخت تکلیف میں ہے بی بی!“ بقا محمد نے التجائی انداز میں کہا۔

”آپ چل کر اسے دیکھ لیں کوئی دوائی لکھ دیں۔ میں ڈسپنری جا کر لے آؤں گا۔“

”آپ کیا بات کر رہے ہیں؟“ شاہ بانو نے حیرت سے کہا۔

”میں۔۔۔ میں جاؤں گی وہاں۔ گل لالہ کی بینک میں۔ اور ایک اجنبی کو دیکھنے۔“

”اس وقت سب لوگ سو رہے ہیں۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔ اور پھر میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ بقا محمد نے التجائی شاہ بانو نے کچھ سوچا۔

”بڑی مصلیٰ ہوگی بی بی!“ بقا محمد پھر التجائی لہجے میں بولا۔

”اسے تیز بخار ہے اور سینے میں شدید درد کی شکایت بھی۔“

”شاید نمونے کا کیس معلوم ہوتا ہے۔“ شاہ بانو نے سوچا اور پھر ٹنگ پر پڑی اپنی سیاہ کھلی کی چادر اٹھا کر اوڑھتے ہوئے بولی۔

”چلو۔ دیکھ لیتے ہیں۔“

ڈیوڑھی سے نکل کر بقا محمد کی سمیت میں گل لالہ کی بینک کی طرف جاتے ہوئے انجانا سا خوف شاہ بانو کے دل پر طاری ہو گیا۔

بلاشبہ انسانیت کے ناطے یہ ایک فرض تھا۔ لیکن درگاہ شریف کے اندر کی دنیا میں ایسی جسارت کرنا گستاخی تھی۔

بڑے شاہ جی کی خواہش کے مطابق میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنا ہی ایسا فیصلہ تھا جس پر اس برادری کے افراد سال میں اکثر کئی بار فرد جرم عائد کرتے اور صفائی کا موقع

دے بغیر ہی یہ کہہ کر فیصلہ صادر کر دیا جاتا۔

”زمانہ بڑا خراب ہے“ شاہ بانو کی بیٹیاں اب کھلے عام کالجوں تک پہنچ گئی ہیں۔“ اور شاہ بانو اس وقت اس سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے جرم کرنے جا رہی تھی۔ شاہ بانو کا دل دھڑک رہا تھا۔

بقا محمد نے بینک کا دروازہ کھولا۔ شاہ بانو کی نظریں انہیں گرم دیز کبیل اوڑھے ہوئے اجنبی دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا۔

شاہ بانو بینک کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

چند لمحوں تک بالکل خاموشی رہی۔ بقا محمد دروازے میں کھڑا تھا۔ شاہ بانو نے اشارے سے اسے سمجھایا کہ وہ نہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ بقا محمد نے تیزی سے آگے بڑھ کر اجنبی مہمان کا ہاتھ کبیل سے نکالا اور کلائی شاہ بانو کے ہاتھ میں تھام لی۔

شاہ بانو کی انگلیاں نبض پر رک گئیں۔

اجنبی نے یہ مہمان کس محسوس کرتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور پھر گویا کائنات کی گردش رک گئی۔

آنکھوں کے سامنے کا منظر بے حد خوبصورت تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے جلتے ہوئے بدن پر کسی نے لہندے پانی کی پھوار برسادی ہو۔ سیاہ مٹھلیں چادر میں سر تپاؤں کی ہوئی وہ مہمان پر ہی نبض کی چانچ میں تھو تھی۔ اس کی نظر میں اپنی دوسری کلائی پر بندھی کھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ وقت گزر رہا تھا۔

ایک سینکڑہ پھر دسرا۔ اور پھر تیسرا۔

اجنبی نظروں کے سامنے ایک جہان آباد ہو چکا تھا۔

”ہوں!“ کہہ کر اکثر زوالے مخصوص انداز میں شاہ بانو نے بقا محمد کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور پھر اشارہ کیا کہ کبیل ذرا پرے کر دیا جائے۔ بقا محمد کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی اجنبی نے کبیل ہٹایا۔ اور انہیں کی کوشش کرنے لگا۔

”آپ لیٹے رہیے۔“ شاہ بانو نے کہا اور جبکہ کر اس کے سینے پر اسٹینہ کوپ رکھ دیا۔ دھک دھک کرتے دل کی ساری دھڑکنیں شاہ بانو کے کانوں میں اتر گئیں۔

شاید۔۔۔ بیماری کی نوعیت شدید تھی کہ کسی قدر پریشانی کے آثار شاہ بانو کے چہرے سے عیاں ہو گئے۔

”نمونہ کا ایک ہے۔“ شاہ بانو نے بقا محمد کو اطلاع

دی۔ ”انہیں ہسپتال لے جانا پڑے گا۔“

”لیکن بی بی! اس وقت۔“ بقا محمد بھی پریشان ہو گیا۔

”ہاں۔۔۔ یہ بہت ضروری ہے۔“ آپ فی الحال ایک انجکشن لے آئیں۔ میں لکھ دیتی ہوں۔ اس سے صرف وقتی طور پر طبیعت سنبھل سکتی ہے۔ صبح آپ نور پاپا کے ساتھ انہیں لے جا کر ہسپتال میں داخل کروادیں۔“

تیز کی دراز سے شاہ بانو نے گل لالہ کا زاتی رائٹنگ پیڈ اور قلم نکالا اور سامنے کرسی پر بیٹھ کر اس نے اجنبی سے پوچھا۔

”آپ کا نام؟“

”راج میر۔“ اجنبی نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

شاہ بانو کے ہاتھ میں پیڈ پر قلم رک گیا۔

”آپ۔۔۔“ اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن وہ پورا فقرہ ادا کرنے سے پہلے ہی اس کا مطلب سمجھ چکا تھا۔

”اچھا!“ کہہ کر شاہ بانو نے انجکشن کا نام لکھنا چاہا تو اس کی آواز دوبارہ آئی۔

”آپ کوئی زحمت نہ کریں۔ میں بغیر ٹیسٹ کے کوئی انجکشن نہیں لے سکتا۔ اس سے زبردست ری ایکشن کا خطرہ ہو سکتا ہے۔“

اس قدر بھرپور وضاحت سن کر شاہ بانو اس کی طرف رجحانی رہ گئی۔ محسوس چہرے پر چمکتی ہوئی آنکھیں بچ کر رہی تھیں۔

”ہمارے ہاں خواتین کو سامنے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہونے کی تربیت دی جاتی ہے۔ کپ کی منصف کا احترام ہماری سرشت میں شامل ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ نقاہت کی بنا پر میں انھ سے نہ سکا۔ حالانکہ ہمارے ہاں تو۔“

اس کی آنکھیں چمک چمک جانے کو تھیں۔ کسی نامعلوم احساس کی بنا پر آواز زندہ ہو گئی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ شاہ بانو ہنسنے لگا۔

”آپ آرام کیجیے صبح دیکھ لیں گے۔“

دور درازے کی طرف بڑھی۔ بقا محمد بھی ایک کرسی پر چلا آیا۔ شاہ بانو کے چہرے پر تأسف اور شرمندگی کا احساس نمایاں تھا۔ اس نے بقا محمد کو چند باتیں دیں۔ اور حویلی کی طرف جانے کے لیے بڑھی۔ لیکن مانی کی کی درگاہ اور حویلی

کے بیچ بنے راستے کے عقبی حصے سے شاہ بانو نکل کر سامنے آیا۔

شاہ بانو کا سارا وجود پتھر کا ہو گیا۔

”کہاں سے آ رہی ہو اس وقت؟“ اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

شاہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آن دیکھی اور ان جانی تقدیر کا مالک بننے کا یہ دعوے دار۔ اس کا سگاموں زاد اور پھر بھی زاد تھا۔ رشتوں کی ان لڑیوں نے اس عجب ابھی ہوئی کتھی میں شاہ بانو کی ذات کو مقید کر دیا تھا۔

وارثت اور گدی نشینی کے فرسودہ طریقہ کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش میں صدیوں کے نمایاں فرق سے بے نیاز بزرگوں کے فیصلے نے یہ دن دکھایا تھا کہ جہاں اب شاہ بانو کی حویلی میں میٹرک لیل شاہ بانو آوارہ اور نکلا ہوتے ہوئے بھی میڈیکل سائنس کی لائق فائق طالبہ شاہ بانو کے مقدر کا مالک بن کر اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں سے آ رہی ہے؟ شاہ بانو نے بچ بولنا مناسب سمجھا۔ وہ ہانپتی

خواتین ڈائجسٹ کے شائع کردہ

چار نئے اور خوبصورت

ناول

۱. دل، دیبا، دہلیز، رخصت سرن 600 روپے

۲. وہ خبیثی سی دیوانی سی آہ سہروردی 400 روپے

۳. جو پلے تو جاں سے گزرنے لگا 150 روپے

۴. ساگر، دیبا، ہادل، لونڈا، دھیمیں 250 روپے

قیمت بھی نئی آمد یا ایک ڈرافٹ سے بھرنی

ڈاک خرچ اور پیکنگ فری

منگوانے کا پتہ

• مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 بعد بانڈ کراچی

• لاہور اکینڈی 206 سرگرم روڈ لاہور

تھی کہ غلط بیانی کی وجہ سے وہ کوئی بھی طوفان برپا کر سکتا ہے۔ اس نے جب ساری بات بتادی تو وہ کسی ناگ کی طرح ہنکار کر بولا۔

"دیکھی انسانیت کی خدمت کرنے کا بہت شوق ہے جنہیں۔ میں پوچھتا ہوں کس کی اجازت سے مئی تھیں۔" "اپنے دل کی اجازت سے۔" جانے کس طرح بہت کر کے شاہ بانو نے کہہ دیا اور یہ جواب سن کر شاہ باہر بھڑک اٹھا۔

"تمہارے دل کا کیا ہے؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "وہ تو کم بخت شہری لڑکوں کے ساتھ مردوں کی چیر بھاڑ کر کے بھی نہیں بھرا۔ اب کیا زندوں پر تیر چلانے کی اجازت دے دی ہے اس نے؟" "شاہ باہرا" اس نے اونچی آواز میں احتجاج کیا۔ "تم میری توہین کر رہے ہو۔"

"توہین تو اپنی تم خود کر رہی ہو۔" وہ فحشے سے بولا۔ "اونچی شان اور اونچے نام والے شاہ محی الدین کی پوتی ہو کر غیر محرم مردوں کے سامنے جاتے جیسے شرم نہیں آتی۔"

"میں اسے انسانی زندگی کا معاملہ سمجھتی ہوں۔" شاہ بانو نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ اور اس کے لہجے کی مضبوطی کا احساس کرتے ہوئے شاہ باہر کا غصہ اور تیز ہو گیا۔

"واہ جی دام۔" وہ لڑا کا عورتوں کی طرح ہاتھ نہچا کر بولا۔ "ساری دیکھی انسانیت کی فحشے دار ہو تم۔ میں شاہ لالہ سے تمہاری شکایت کروں گا۔" اس کا اشارہ صفدر حسین شاہ کی طرف تھا۔

"تم کون ہوتے ہو؟ شاہ لالہ سے میری شکایت کرنے والے؟"

شاہ بانو کی اس بات پر وہ فحشے سے تھماتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اور اس کا بازو تھام کر بولا۔

"لیڈی ڈاکٹر شاہ بانو! کسی اور خیال میں مت رہنا۔ کیونکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کون ہوں؟" اپنے بازو پر اس کی مضبوط گرفت کا احساس کرتے ہوئے وہ کانپ اٹھی۔ شاہ باہر نے اس کا بازو جھٹکا۔ اور اپنی لپٹی کی بکھل مارتے ہوئے ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ وہ کمرے کی زرد فلکی روشنی میں دست بھردی رہی۔ شاہ بانو کی اس طرح تذلیل کرنا شاہ باہر کے لیے کوئی نئی

بات نہیں تھی۔ وہ تو ہمیشہ اسی طرح کرتا تھا۔ ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ پرواز کیلئے ہونے وقت کی اس تیز ترین صدی میں بیت جانے والے لمحوں کے کچھ فیصلے بڑے ظالم تھے۔ جن کے تحت اعلا سرکاری عہدہ دار صفدر حسین شاہ نے میٹرک پاس بتول بی بی کو جاہل اور گنوار کہہ کر ٹھکرا دیا تھا اور آوارہ مزاج شاہ باہر کو اعلا تعلیم یافتہ شاہ بی بی کے لیے بالکل موزوں قرار دیا گیا تھا۔

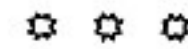
ایسے فیصلے کرنے والے بہت دور جا چکے تھے۔ لیکن حق جتانے کی خاطر شاہ باہر بار بار راست بدل کر شاہ بانو کے راستے میں آجاتا اور طنز کے تیر چلا کر اس کے احساسات اور جذبات کو کچل کر دوبارہ اپنے معمولات میں کھوجاتا۔

لیکن۔۔۔ آج حال کے اس دور اسے پر پٹ کر جانے وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھامہ کی معیت میں گل لالہ کی بیٹھک میں جانے کے بعد شاہ بانو پلٹ کر وہاں سے واپس نہ آسکی تھی۔ اس اجنبی چہرے کی ایک جھلک دیکھ کر اس کی گفتگو کا فقط ایک جملہ سن کر شاہ بانو کا دل بیٹھک کی

ڈیلیر کے اندر ہی وہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جاگ رہی تھیں۔ انگلیوں کی پوروں پر اس کی کاکائی کا نس اور اس کی آنکھوں کے سارے رنگ شاہ بانو کے دل کے اندر اتر گئے تھے۔ صبح کا اجالا ظہور ہوا تو دل کی سحر کے سب سے بڑے بدل چکے تھے۔ شاہ بانو کی سوچ کے زاویے گہرے ہو گئے۔

"اس کا نام۔۔۔ اور پھر گفتگو کے دوران دو مرتبہ "ہاں۔۔۔ ہاں" کی ٹکڑا۔۔۔ بھلا وہ کہاں سے آیا تھا؟ کس ٹکڑا کا باسی تھا؟ پھر اس کا انجکشن لگوانے سے انکار۔ یقیناً وہ اجنبی ضرور تھا۔ لیکن لا علم نہ تھا۔ ایک عام انسان کے ذہن میں کسی انجکشن کے ری ایکشن کی بات آئی نہیں سکتی تھی۔

اگر ایسا تھا تو پھر اس ظالم رت میں اس اجنبی کی آمد بھلا کہاں سے اور کس مقصد کے تحت ہوئی تھی؟ اور پھر اس کا یہ کہنا کہ "ہمارے ہاں" تو خواتین کے احرام کا دورس لایا جاتا ہے۔ بھلا وہ کہاں سے آیا تھا؟ شاہ بانو کا ذہن الجھ گیا۔



وادئی میں صبح اپنے صبح رنگ میں اتری پیسیدہ سحر کے چیز کے درختوں سے نیچے اتر کر وادی میں اپنا رنگ جمایا۔ بھامہ نے اجنبی کو ہسپتال لے جانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس کا انکار سن کر وہ فکر مند ہی سے بولا۔

"آپ بہت بیمار ہیں جی! ڈاکٹر بی بی بتا کر گئی ہیں آپ کا

لوہیہ جب ہسپتال لے جانا بہت ضروری ہے۔" "آپ کی ڈاکٹر بی بی کا خیال صحیح نہیں۔" وہ قحط سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے سردی کی شدت سے بخار ہے۔ دو دنہ بھی لوں تو ہیم کو مکمل حرارت میسر آنے کے بعد اتر جائے گا۔ آپ فقط یہ کریں کہ یہ گولیاں لے آئیے۔"

اس نے میز پر رکھا رائٹنگ پیڈ اٹھایا۔ جس پر رات شاہ بانو نے اپنی خوبصورت لکھائی میں اس کا نام "راج میر" لکھا تھا۔ دونوں لفظوں پر اس کی نظریں جم گئیں۔ اور شاہ بانو کا مکمل سراپا اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔

وہ اس وقت فور محمد جمال کے ساتھ بیٹھک کے دروازے میں کھڑی تھی۔

اجنبی اس کے ڈھکے چھپے سراپا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ "میری شخصیت غلط نہیں۔" وہ مخصوص ڈاکٹری انداز میں کہہ رہی تھی۔ "تمام شواہد بتا رہے ہیں کہ بلاشبہ یہ لوہیہ کا کیس ہے۔ آپ کو ضرور ہسپتال جانا چاہیے۔"

یہ دو پلٹ کر فور محمد جمال سے مخاطب ہوئی۔ "آپ انہیں لے جائیے ڈاکٹر حسین سے کہہ دے گا کہ ان کا خیال

درمیان۔۔۔ وہ واپس چلی گئی۔

اجنبی اب انکار نہ کر سکا اور بھامہ کی معیت میں باہر نکل آیا۔

سبک خرازی سے پھٹے ہوئے شاہ بانو کا سراپا شاہوں کی نو بی بی بڑی ڈیوڑھی کے اندر درجہ جمل ہو گیا۔

نئی رات کے ظالم لمحوں کا انقلاب زندگی بدل کر بہت اگے نکل چکا تھا۔ جب وہ نور محمد جمال کے ساتھ ڈاکٹر حسین کے کمرے سے نکلا تو وہ نمونہ کی شخصیت کہنے کے بعد فوری طور پر وہی انجکشن لگانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جو رات شاہ بانو نے تجویز کیا تھا۔

ہسپتال کے بستر پر دراز ہوتے ہی وہ اپنے اندر آنے والے ایک انقلاب سے باخبر ہو چکا تھا۔ اس کے دل نے تو آج تک کبھی کسی کی بات نہیں مانی تھی۔ اپنی برادری اپنے گہرائی اور دوست احباب کے حلقے میں وہ نہایت ضدی اور سرکش جانا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی منوا تا اور کبھی کسی کی بات نہ مانتا تھا۔ لیکن آج اس کا دل شاہ بانو کے اک حکم کی دلیل میں انکار نہ کر سکا۔ اور وہ بغیر کچھ کہے ڈاکٹر حسین کے درمیان سیچاکی ہر بات مان رہا تھا۔

وادئی میں شام اتر آئی اور حویلی کے اندر لکڑیاں جلا کر مکئی کی نرم روٹی توڑے پڑا لٹے ہوئے جھولنے لگے۔ آواز میں شاہ بانو سے پوچھا۔

"تورات بیٹھک میں کیوں گئی تھی؟"

شاہ بانو نے چونک کر اس سوال پر ان کی طرف دیکھا۔ جلتی لکڑیوں کا آتش کالی عکس بتول بی بی کے چہرے کو کھنکھاتا رہا تھا۔ ان کے سفید ہاتھوں کی لمبی انگلیاں آنے کو صدارت سے روٹی کی قفل میں دینے میں مصروف تھیں۔ ان کے لہجے میں شک نہیں بلکہ تجسس تھا۔

شاہ بانو خاموش رہی۔ "شفی بتا رہا تھا کہ بیٹھک میں کوئی اجنبی مہمان آیا ہے۔ شاہ بانو کی خاموشی کے جواب میں جھول نے اپنی بات دوبارہ شہن کی۔

"جی ہاں۔" شاہ بانو نے جھکے سے راکھ کریدتے ہوئے جواب دیا۔ "بھامہ کا اصرار تھا کہ بخار میں جلتے ہوئے ایک اجنبی مریض کو ایک ڈاکٹری حیثیت سے دیکھ لیا جائے۔"

"اوہ!" بتول بی بی نے اپنے لالے اور جھکے بھائی شاہ باہر کے لیے نہایت صدارت سے پکائی گئی مکئی کی روٹیوں کو ایک دوسرے کے اوپر جھاتے ہوئے بڑی گہری سانس لی۔

"بات تو تمہاری درست ہے۔" انہوں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن بھامہ کی کم عقلی کسی دن ہمیں مشکل میں ڈالے گی۔" سادہ لوح بتول بی بی کا یہ تبصرہ شاہ بانو کو بہت برا لگا۔

"تمہیں شاہ باہر کی عادت کا پتہ ہے۔" وہ پھر گویا ہو گئیں۔

"ہم لوگ کنویں کے مینڈک ہیں ہمیں منڈیر تک آنے کی اجازت تو ہے۔ لیکن باہر کی دنیا میں جانے کا پروانہ ہمیں بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ تمہارا میڈیکل کانج میں جانا تو شاہ جی کا اک پرانا خواب تھا۔ بہتر ہے کہ اب تم اس سے آگے نہ بڑھو۔"

"آگے بڑھنے کا کون سوچ رہا ہے آپلی!" شاہ بانو نے مدھم آواز میں کہا۔ "یہ تو صرف الزام تراشی ہے۔" اسے غصہ آ گیا۔

"شفی بتا رہا تھا کہ رات شاہ باہر نے تمہیں دیکھ کر نہایت ترش لہجے میں ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اور تم سو نہیں سکیں۔"

"آپ کے بھائی کا یہ رویہ اجنبی تو نہیں آپلی!" اس نے دکھ سے کہا۔ "میں تو اس رویے کی عادی ہوں۔"

سارا دکھ درد بن کر آنکھوں میں سمٹ آیا۔
”صغی!“ ان کے دل نے سسکی لی۔ ”کیا کبھی تھی میری
ذات میں؟ جو میں تمہاری زندگی مکمل نہ کر سکی؟“

عندروہ برس کی تو عمر تھی میری۔ جب میں نے کچی مٹی کے
گھروندے بناتے ہوئے تمہارے خواب دیکھتے لیکن
تمہارے ہاتھ کی فقط ایک ضرب نے میرے تمام خواب
کا کچھ کی جوڑیوں کی طرح توڑ ڈالے۔ ساری کچیاں بہت
دور اندر تک میرے دل میں پیوست ہو گئیں۔ دل کے
جہان کا یہ تماشا ساری برادری نے دیکھا۔ لیکن تم نے اللہ
ماؤرن شیرین جمال کا ہاتھ تمام کر دیا کے اس پار اپنا جہان
بسا لیا۔ سب ہی وہابی دیتے رہ گئے۔ مگر تم پر کسی بات کا کوئی
اثر نہ ہوا۔ ہم دونوں کی دنیا الگ الگ ہو گئی۔

ہاں مگر کیسی دل فریب رت کا سماں تھا کہ ہمارے اس
آغاز پر تم زندگی بن کر چلے آئے۔ میرے لیے مجازی خدا کی
دستار فضیلت تمہارے سر پر سج گئی۔ میرے لیے قبولیت
کے تمام در کھل گئے۔ تم نے قبول کیا۔ چاہا اور سماں کا
سرخ جوڑا میرا مقدر بن گیا۔ میں خوش تھی لیکن میری
خدمت گزار تھی تمہارے ماتھے کے بل دور نہ کر سکی۔ ہم
ابھی ہوئے مجھے ملے۔ اور اک لمبی تقریر میں یہ واضح کر کے
کی کوشش کی کہ یہ شادی اک مصلحت تھی۔ گدی نشین
شاہوں کی زندگی کی وہ رواجی مصلحت جس کے تحت وہ بھی
بھی نہیں چاہتے کہ وارث کا سلسلہ کسی بھی طور متاثر
ہو۔ وہ اسی ایک جہان میں دو الگ الگ زندگیاں جیتے ہیں۔
ایک صرف اپنے لیے اور دوسری اپنی برادری اپنی وراثت
اور اپنے بزرگوں کے لیے۔

اور اس ساری کشمکش میں ایک عورت، صرف ایک
عورت کی زندگی، زندگی نہیں رہتی۔“

شاہوں کے اس ڈیرے میں بتول بی بی بھی ایسی ہی
زندگی جی رہی تھیں۔ گزرتے وقت اور حالات نے انہیں
حد درجہ کرخت بنا دیا تھا۔ جب کبھی صفدر حسین شاہ کی آمد
ہوتی۔ ان کا دل موسم بن کر پھل جاتا۔ رات شمع بن کر
جلتی اور اس جلتی ہوئی شمع کا ہر آنسو پکارتا۔ ”صغی“
”صغی“

اور۔ ”صغی“ سید صفدر حسین شاہ، عجب بے نیازی کا
رنگ لیے ہوئے آتے۔ نیچے قبرستان کے قریب گاڑی
رکتی۔ وہ باہر تشریف لاتے۔

اونچا لباس، جیسے اور از قد، مسخ و سفید چہرہ، سنہری فریم

”عادی تو تمہیں ہوتا ہی پڑے گا۔“ بتول بی بی نے اپنی
زندگی کے تمام تر شکستہ اسباب کو مسترد کرتے ہوئے بڑے
وثوق سے کہا۔ سخت غصے کے عالم میں شاہ بانو اپنے کمرے
میں آئی۔

یہاں پر۔ زندگی اپنے اندر بڑی سخت دوغلی پالیسی لیے
ہوئے تھی۔

شاہ کوٹ کی اس وسیع برادری سے تعلق رکھنے والے
ہر فرد میں یہ زبردست کمزوری پائی جاتی تھی کہ جس امر کو وہ
اپنے لیے بالکل صحیح اور جائز قرار دیتا۔ دوسرے رشتوں اور
افراد کے لیے وہی امر اعتراض کا باعث بن جاتا۔ شاہوں کی
حوصلی کے اندر بتول بی بی کا کردار ایک مظلوم اور مسکین
عورت کا تھا۔ لیکن شاہ بانو اور شاہ باہر کے حالات متعین
کرتے وقت وہ ایک خالیم اور رواجی مند کے روپ میں
سامنے آ جاتیں۔ جنہیں اس سے بزرگ کوئی دل چسپی نہ
تھی کہ مستقبل میں جب ایک اعلا تعلیم یافتہ لیدی ڈاکٹر کو
تالانق اور نچے شاہ باہر کے ساتھ باندھ دیا جائے گا تو پھر
زندگی کا رنگ بھلا کیا ہو گا۔

ایسا سوچنا تو ضرور چاہیے تھا۔
مگر نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کی ناکامی کا ذمہ دار تقدیر
اور نصیب کو ٹھہرانے والی ایک عام رواجی عورت تھیں۔
سہ پہر کے اس سے اس رواجی عورت کا دل اس وقت بے
بے طرح دھڑکا۔ جب شاہ باؤس کے اونچے چوہارے سے نیچے
اس کی نظر دیا پر بنے جھولتے ہوئے پل پر پڑی۔ صفدر
حسین شاہ کی سفید سرکاری جیب پل پر سے گزر کر اوپر کی
سمت آ رہی تھی۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ تو ہمیشہ اسی طرح آیا کرتے
تھے بغیر اطلاع کے۔ ایک دم ان کی بے وقت اور بلا سبب
آمد کا بھل بچ بایا کرتا۔ بقا محمد اور نور محمد جہاں کی جان پر بن
آتی۔ لیکن شاہ کوٹ کی اس اونچی بستی سے ان کی گاڑی
کا نظر آ جانا اک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا کہ جب
تک ان کی گاڑی بابا شادی شہید کی زیارت کا علاقہ کر اس
کر کے شاہ کوٹ تک پہنچتی۔ وہ دونوں اکثر معاملات
درست کر چکے ہوتے۔ اور بتول بی بی بھی کسی نہ کسی طرح
دھڑکتے دل کی تمام دھڑکنیں سمیٹ کر اپنے اندر کے جہان
میں سمٹ چلی ہوتیں۔

لیکن آج۔ خدا جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکیں۔
خاموشی سے شاہ باؤس کی دہلیز پر بیٹھ گئیں۔ اور بیٹے سے کا

لگے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی براؤن آنکھیں۔ ستواں ناک اور دل کش دہانہ بے حد خوبصورت اور متوازن چال کے ساتھ چلتا ہوا بقتل مٹھی کے "قدرت کا یہ دل کش شاہکار" اپنے جوتوں کی "چوں چوں" والی روایتی موسیقی بھیرتا ہوا۔ قبرستان کی سفید چار دیواری کے اندر آن رکنا۔ دونوں ہاتھ فاتحہ کے لیے اٹھ جاتے۔ وہ چاروں سمت نظر دوڑاتے۔ اور پھر اک قبر کا کتبہ ان کی منظر آنکھیں غم کر دیتا۔

سیدہ زہرہ فاطمہ کی مرتد پر کھڑے اکثر ان کا وجود بکلی لرزش کی "زد" میں آ جاتا۔ کچھ بھر کے لیے وہ ٹوٹ جاتے۔ بکھر جاتے کہ وہاں ان کی ماں کا مقدس وجود تھا۔ بھٹک کر خاک اٹھاتے اور آنکھوں سے نکالتے۔ اپنے سفید ہاتھوں سے ماں کی قبر کی مٹی کو صاف کرتے۔ ایک نظر شاہ عی الدین قادری کے مرتد پر ڈالتے اور پھر گزرتے ہوئے ان انسانوں سے اس جذباتی ملاقات کے بعد وہ زندوں کی خبر لینے کے لیے حویلی کے اندر کی دنیا کی طرف بڑھ جاتے۔ جہاں ان کی ذات کی دہشت اور دب۔ اس قدر تھا کہ اکثر اوقات شاہ باہر جیسا صدی مزاج اور اکھڑ بھی اپنے ٹل میں دھک جاتا اور ان کے باقی ماندہ قیام کے دنوں میں بٹا محمد اور نور محمد جواں کی جان پرینی رہتی۔

وہ بڑے ٹھانڈے سے اپنی اس ریاست میں قیام فرماتے۔ البتہ مالی کمی کی درگاہ پر حاضری دیتے ہوئے اکثر ان کا دل خوف سے لرز جاتا۔ کیونکہ مالی کمی کی لاڈلی بتول بی بی کو اپنی زندگی سے نکال کر وہ صریحاً ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کر چکے تھے۔ جس کا کفارہ ادا کرنا ناممکن تھا۔ سوچیں۔ گہری بہت گہری ہو گئیں۔

آوازوں نے حقیقت کا روپ دھار تو بتول بی بی چونک اٹھیں۔ سامنے بنے چھوٹے سے حوض کے شرے ہوئے پانی میں ان کا عکس بول رہا تھا۔ وہ آج بھی مکمل تھیں۔ بالکل مکمل اور زندگی سے بھرپور۔ اب تو تقریباً پچیس کا سن تھا لیکن ان کی ذات مکمل تھی۔ چہرے کی کڑختی میں صفی کی آمد کے ساتھ ہی معصومیت کا تاثر ابھر آتا۔ اللہ عمر والے تمام بانگے انداز وجود کے اندر ان موجود ہوتے۔ وہ لہرا لہرا کر بکھر بکھر کر ہر انداز سے اپنے ہونے کا اعلان کرنا چاہتیں۔ لیکن زمانہ آڑے آ جاتا۔ اور وقت۔ بہت دور بہت آگے بڑھ کر جاتا۔

صفدر حسین شاہ دوم بھر کے لیے رک کر سستاتے اور

بھڑاپاں اپنے جہان کی طرف کوچ کر جاتے۔ آج اس سے کی بے خبری بھی عجیب نوعیت کی تھی کہ انہیں صفی کی آمد کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

حوض کے ٹھہرے ہوئے پر سکون پانی میں کوئی پتیا کنکری مگری اور پانی میں اچھل چھٹی۔ چند ایک لہریں ابھریں۔ ڈوبیں اور پھر ہموار رخ کے اس پار صفدر حسین شاہ کا سایہ ابھر گیا۔ سر پرسی چٹکیلی دھوپ گواک بادل نے اپنے وجود کے اندر پناہ دی اور اپنے چہرے کے نیچے دھوپ چھاؤں کا دلکش ساں بکھر گیا۔ بتول بی بی نے۔ نظریں اٹھائیں۔ حوض کی منڈیر کے دو سری طرف صفدر حسین شاہ کھڑے تھے۔

وہی تیر، وہی نکاہیں، اور وہی عام غریبوں کا صاحب سید صفدر حسین شاہ۔

"صفی!" بے اختیار کانٹے لبوں سے دل کی آواز آئی۔ محض ہونٹ ملے۔ آواز نہ نکل سکی اور بتول بی بی کا سر اٹا اک لمحے کے لیے انہیں چونکا گیا۔

شاید۔ وہ آج بھی ویسی ہی تھیں۔ اسی قدر باگی اور نئی ٹوپی صرف پندرہ سال کی عمر میں ان کی زوجیت میں آنے والی۔ سیدہ بتول بانو، آج بھی دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا کہ وقت اسے صرف چھو کر گزر گیا ہو۔

وہ بے قصور تھیں۔ آج بھی اور تب بھی۔ جب انہوں نے دراشت کی لان رکھنے کے لیے انہیں قبول کیا تھا۔ وہ آج بھی اس دنیا اس جہان کے اندر تو موجود تھیں۔ لیکن ان کے دل میں نہ تھیں۔

تو پھر۔ وہ اس وقت کہاں تھیں؟ شاہ عی الدین قادری کے مرتد اور مالی کمی کے دوبار کے بچوں جیج ایک جھوم کے درمیان خال اور اکیلی بتول بی بی۔

وہ بے اختیار آگے بڑھیں۔ لیکن یکدم ٹھنہک کر رک گئیں۔

صفدر حسین شاہ کی آواز اک زہریں کر جسم و جان کے اندر اتر گئی۔

"تم کیا سمجھتی ہو بتول فاطمہ! آج بھی اس قسم کی ادائیں دکھا کر تم مجھے جیت سکو گی؟"

آرزوؤں کے تمام جھللاتے ستارے دل کے آسمان سے گر کر چٹکا چور ہو گئے۔ وہ آگے بڑھے اور چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔

"راستہ چھوڑو۔" وہ حاکمانہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"اور کبھی اس خیال میں مت رہنا کہ اس طرح روپ بدل بدل کر میرے سامنے آنے سے تم میرے دل پر حکومت کرنے کا پرانا خواب پورا کر سکو گی۔"

وہ ساکت و جاغ کھڑی رہ گئیں۔

صفدر حسین شاہ کا متحرک سایہ شاہ باؤس کی اندرونی دنیا میں سما گیا۔ جلی دھوپ نے بادلوں کی آغوش سے نکل کر دوبارہ وادی میں اپنا ڈیرہ جمایا۔ ہوا چڑے کے درختوں سے سرکوشی کرتے ہوئے "شاہ باؤس" کے اونچے چوہارے پر اتر آئی جب ہی اپنے دل کی دھکی دنیا کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف۔ بتول بی بی کو بھانپ کر آواز سنائی دی۔

"آپ اندر حویلی میں تشریف لے چلیے بی بی! اب شام ہو چکی۔ ہوا بہت سرد ہے۔"

"ہاں!" بتول نے بڑی گہری سانس لی۔ "شام تو سب سے ہو چکی۔ میں نے زندگی کے خواب رکھے اور جب آنکھ کھلی تو سویرا نہیں تھا۔ شام تھی۔ فقط زندگی کی شام۔ جس میں بتا کسی قصور کے کسی جرم کے۔ ایک لڑکی آرزوؤں کی دار پر بھول گئی۔ صرف اس لیے کہ وہ باؤفا اور بزرگوں کے فیصلوں کی پابند تھی۔" بھینکی پلکوں تلے رات جلتی رہی۔



اس مرتبہ شاہ لالہ اکیلے نہیں آئے تھے۔ بلکہ ان کی چھوٹی دونوں بہنیں چمن اور ورشہ کے علاوہ چھوٹا لاڈلا بھائی ذکا اللہ عرف ذکی بھی ساتھ تھا۔ اس کی اور شاہ لالہ کی عمر کے درمیان بائیس برس کا فاصلہ حامل تھا۔ کیونکہ والد محترم نے شریعت کے احکامات کی پیروی کے ضمن میں کوئی دو سرا کارنامہ سرانجام نہ دے سکنے کے باعث اپنی رحلت سے چند سال قبل اپنی ایک بیوہ سرمدی کو شرف قبولت بخشا تھا۔

ذکا اللہ کی پیدائش کے بعد موصوف کو اس کے اپنے بھائیوں نے روایتی غیرت کے پکر میں آکر عرس کے موقع پر بھری برادری کے سامنے قفل کر دیا۔ شاہوں کے ڈیرے کو تھانے کچہری۔ تک رسوا ہونا بڑا۔ برسوں مقدمہ چلا اور جب ذکی نے شعور کی منزل پر قدم رکھا تو قابل بری ہو چکے تھے قفل کی شام جب مرحوم نے آخری سانس لی تو عالم وحشت میں اپنے اوپر جھکے ہوئے شاہ لالہ کے کانوں میں ان کی آخری التجا جس فریادیں کرا رہی تھیں۔

"میں نے ناکرہ گناہوں کی معافی کی فریاد کے بعد ننھے ذکی

کے لیے زندگی اور محبت کی بھیک مانگ کر وہ آنکھیں بند ہو گئیں اور سخت کیڑو وحشی مزاج شاہ لالہ کے دل کے درختے پھول گئیں۔

شاہ ہمالی نے ذکی کو بالا اور جب شاہ لالہ نے اعلا سرکاری حیثیت پر فائز ہونے کے بعد اپنی زندگی الگ کرنے کا فیصلہ کیا تو اسے ہمراہ لے گئے۔ بچے کی ذات کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ وہ شاہ لالہ کو اپنا۔ بے تسلیم کر کے اسے تو یہی بتایا گیا تھا لیکن شیریں، مارا ماننے سے مار رہی تھیں۔ ماں کی حیثیت سے شاہ لالہ کی "داس" کی درس دہی صرف یہی نہیں۔ بلکہ حالات کے تحت وہ زیر دست جرنیشن ٹیپ کا شکار ہو چکا تھا۔ شہر میں رہتے ہوئے بھی وہ شفی کو اپنا بہترین دوست سمجھتا تھا اور شاہ کوٹ میں رہائش اس کی اولین ترجیح تھی۔ جب کہ چمن اور ورشہ کو بہترین معاشرتی تہذیب میں سیٹ کرنے کی غرض سے شاہ لالہ سب کی مرضی کے خلاف اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اب وہ دونوں کانچ میں زیر تعلیم تھیں۔

شاہ لالہ کی کامی انداز دیکھ کر بڑے شاہ بانو کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ شاہ لالہ اپنی حد تک تو اپنی باتوں کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن کبھی کبھی شاہ بانو کی تعلیم کے متعلق طنز کے تیر چلا جاتے۔ اور یہ زہریلا لہجہ شاہ بانو کو دھکی کر دیتا۔ دھکی اس کی مشترکہ سرحد پر وہ شاہ ہمالی کے کندھے پر سر رکھ کر رو دیتی کہ ایسے وقت کی وہی بہترین ساتھی تھی۔

آج بھی بہت دنوں کے بعد شاہ بانو کے کمرے میں محفل جمی۔ چمن اور ورشہ کے پاس شیریں بھابھی کے خلاف شکایت کا ایک بلندہ تھا۔ جسے وہ شاہ بانو اور بتول کے گوش گزار کرنا چاہتی تھیں۔

"اب انہوں نے ہمیں انیکسی میں الگ کر دیا ہے۔" ورشہ کہہ رہی تھی۔ "بڑی کو بھی میں صرف وہ اور شاہ لالہ مقیم ہیں۔ ان سے کبھی کبھار ڈانٹک نیبل پر ملاقات ہو جاتی ہے۔ ان کا جب دن شروع ہوتا ہے تو پانی لوگوں کے لیے رات ہوتی ہے، سارا وقت سونے میں ٹون پر گپ شب، شاپنگ میں گزر جاتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے شہر میں راتیں جاتی ہیں۔ فطرت کے ہر قانون کو شکست دینے میں ہم لوگ اپنا ٹالی نہیں رکھتے اور۔"

"اور۔ یہ کہ۔" چمن نے بتول کی طرف دیکھتے ہوئے ورشہ کی بات کاٹ دی۔ "یہ جو اپنے شاہ لالہ ہیں نا اتنے

بارعب بے حد غصے والے تو واضح ہو خواتین و حضرات کہ یہ موصوف شیریں بھابھی کے سامنے بولنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتے۔ ہر وقت بھٹی مٹی بنے رہتے ہیں۔"

آزاد روح بھول کے لبوں پر مسکراہٹ نے ڈیرہ جمایا۔

"اور کیا؟" ذکی بھی چمک کر بولا۔ "وہ بھی تو ہر وقت ظالم سماج کے روپ میں ہمارے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ ہر قسم کے احکامات کچھ اس انداز سے جاری کرتی ہیں گویا کہ وزیر اعلا کے تمام تر اختیارات ان کے پاس ہیں۔"

"نگائی بھائی میں ان کا جواب نہیں۔" ورثہ نے بات آگے بڑھائی۔

"شاہ لالہ کو آفس سے واپس پر اے ٹویژڈ رپورٹ دینا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ اور جب تک وہ چار بائیس اپنی طرف سے شامل نہ کریں۔ انہیں چین نصیب نہیں ہوگا۔"

"ماشاء اللہ۔" بست دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے شفی نے ساری گفتگو سننے کے بعد طنز یہ لہجے میں کہا۔ "کس قدر خوبصورت ماحول میں جی رہے ہو تم لوگ۔ بھائی! میں تو کئی بار پہلے بھی جہیں یہ مشورہ دے چکا ہوں کہ آخر تم لوگ بغاوت کیوں نہیں کر دیتے۔ اہت سبجو ایسی زندگی پر۔ اور پلٹ کر آجاؤ یہاں آخر کیا کی ہے؟ سب ہی کچھ تو ہے یہاں۔"

"آپ کی اس پیش کش کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔" ورثہ لا چاری سے بولی۔ "شاہ لالہ بھلا کب ہمیں آنے دیں گے۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔" شفی نے اس کی بات کی تائید کی۔

"وہ بے چارے اپنی جگہ مجبور ہیں۔ ارے بھائی! اگر تم لوگ بھی وہاں سے شاہ کوٹ آگئے تو ذرا سوچو کہ پھر وہاں کس پر حکومت کریں گے۔ اب بیگم پر تو وہ حکمرانی کا یہ انداز جتانے سے رہے۔" شفی نے قہقہہ لگایا۔ اور سب ہی اس قہقہے میں شریک ہو گئے۔

"چلیں کوئی نئی بات کریں۔"

شاہ بانو نے کہا اور بھول کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"آئی! آپ کوئی بات کریں نا۔"

"کوئی بات؟" بھول بی بی کے دل سے آواز آئی۔ "کوئی اور بات تو زندگی میں ہے ہی نہیں۔ بس زندگی کی کمائی اسی ایک شخص سے شروع ہوئی ہے۔ اور اسی پر ختم ہو جاتی

ہے۔" بھول بی بی کے لب بے اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکیں۔

"چلیں۔ سب لوگ سو جائیں۔ رات بست ہو چکی۔"

جب نہیں ورثہ اور ذکی اپنے کمرے میں چلے گئے تو شفی نے شاہ بانو اور بھول کی موجودگی میں ان تمام حالات پر تبصرو کرتے ہوئے ہاتھ آواز بلند کیا۔

"کبھی کبھی تو شاہ لالہ کو دیکھ کر موصوف کی والدہ ماجدہ کے لیے خواہ مخواہ دعائے مغفرت فرمانے کو جی چاہتا ہے۔ ماشاء اللہ مرحومہ نے کس عظیم الشان نمونے کو جنم دے کر دنیا سے رحلت فرمائی۔"

"ان بے چاری کا کوئی قصور نہیں۔ بھول بی بی نے اپنی مائی ماں کی طرف داری کرتے ہوئے دلیل دی۔" شادی کے اولین چار سالوں میں اولاد نصیب نہ ہو سکی۔ ہماری پھوپھی اس اکثر تیا جی کی دوسری شادی کروانے کی دھمکیاں دیا کرتیں۔ وہ کہا کرتی تھیں۔ "شفی جب زندگی میں آیا تو میرے قدم شاہوں کے ڈیرے پر جمے۔ ورنہ حالات تو مخالف سمت جا رہے تھے۔"

"جی ہاں۔" بھول بی بی کے اس تبصرے پر شفی جل کر بولا۔

"اب وہ دوسروں کی زندگیوں کو اہتر کرنے اور ان کے قدم زمین سے اکھاڑنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ کاش یہ نظارہ مرحومہ بھی دیکھ سکتیں۔"

"شفی! شاہ بانو نے ٹوکا۔ "حد سے مت بڑھو۔"

"یہاں کسی کی کوئی حد نہیں آئی! شفی غصے سے بولا۔

"ہر کوئی اپنی زندگی کی حد بذات خود متعین کر کے جی رہا ہے۔ اور بھلا کیوں کر اور کس طرح یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔"

"اچھا۔ چلو اب سو جاؤ۔" شاہ بانو نے اپنی کورس کی موٹی سی کتاب اٹھائی۔ "میں تھوڑی دیر پڑھوں گی۔"

"ہاں۔" وہ گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ "تم جلدی سے بڑھ لو آئی! شاہ بابر جب تمہاری زندگی اجیرن کرے گا تو پھر نئی کتابیں تمہارے کام آئیں گی۔"

شاہ بانو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ رات بھر ہنسنے پر چلتی رہی۔

صبح دم زندگی شاہوں کے ڈیرے کے اندر اتر آئی۔

بقا محمد حویلی کے اندر آگیا۔ کچھ خوف زدہ کچھ کھبریا

ہوا۔

"بی بی! وہ رازداری کے سے انداز میں شاہ بانو سے مخاطب ہوا۔

"بڑی مصیبت ہو گئی ہے۔" اس نے یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے بات شروع کی۔ تو کمرے کی دہلیز پر کھڑی بھول بی بی کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے۔

"ذاکتر حسین نے مہمان کو چھٹی دے دی۔" وہ رک رک کر بولا۔ "وہ مائی صاحبہ کے دربار کی ساتھی والی کوٹھڑی میں بیٹھا ہوا ہے جی۔ فی الحال سفر نہیں کر سکتا۔ کل لالہ کی بیٹنگ میں شاہ بابر کے مہمان مقیم ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو شفی کے کمرے میں اسے فہرا دوں۔ شاہ لالہ کو پتہ چل گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

چائے کے آخری کھونٹ گویا شاہ بانو کے گلے میں اٹک گئے۔

"اس وقت شاہ لالہ کہاں ہیں؟" اس نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"وہ تو جی باہر والے حجرے میں نور محمد جوال سے حساب کتاب کر رہے ہیں۔ اور ویسے بھی سخت غصے میں ہیں۔"

بھول بی بی دہلیز پر کھڑی شاہ بانو کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرتے ہوئے سب کچھ سن رہی تھیں۔ کسی اجنبی کی آمد ان کے لیے نئی خبر تو نہیں تھی۔ البتہ بقا محمد کے علاوہ شاہ بانو کی اجنبی کے لیے بھر پوری اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والا انکشاف ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ اس انکشاف کا راز جاننے کی کوشش میں وہ صندر شاہ کے لیے تیار کیے جانے والے اسپتال ناشتے کی فہرست میں شامل اجزا کو بھول گئیں اور ان کی تمام تر توجہ بقا محمد اور شاہ بانو کی گفتگو کی طرف مبذول ہو گئی۔

"آپ شفی بھائی سے بات کر لیں۔" تو میں اسے اوپر لے آؤں۔ نیچے مہمان خانے میں تو شاہ لالہ کے ملاقاتی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ورنہ میں آپ کو زحمت نہ دیتا۔" بقا محمد نے کہا۔

بھول بی بی اس کی سمت دیکھتی رہیں۔ شاہ بانو گہری سوچ میں تھیں۔

"ٹھیک ہے۔" شاہ بانو کی آواز آئی۔ "آپ اسے فی الحال شفی کے کمرے میں لے آئیں۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

شاہ بانو کا اتنا واضح فیصلہ سن کر بھول بی بی کانپ گئیں۔

گویا کہ یہ زندگی کے کسی واضح انقلاب کی شروعات تھی۔

اک نامحرم دل کی دہلیز عبور کرنا تھا۔

اپنی عادت کے عین مطابق وہ یہ انکشاف نمک مرچ لگا کر شاہ لالہ کے حضور گوش گزار کر سکتی تھیں۔ لیکن کسی وقتی مصلحت کے تحت خاموش رہیں۔ شفی کا کمرہ حویلی اور مائی مکی کی درگاہ کی مقبی جانب تھا۔ اور شاہ بی بی کے کمرے کے جھونکے سے بخوبی نظر آتا تھا۔ کمرے کے سامنے بنے چوکور برآمدے میں بیٹھ کر وہ اکثر دریا کے اس پار نظریں جھماکے جاتا۔

جہاں سے مقبوضہ علاقے کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی شفی انتہائی ذہن کا مالک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ لالہ سے اس کے نظریات اکثر ٹکراتے۔ وہ دلائل سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا۔ تب بھی کبھار خدا جانے کیوں شاہ لالہ بڑی نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے کی کوشش میں ذرا نرم الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہتے۔

"تم نے زندگی کو صرف کتابوں میں پڑھا ہے۔ حقیقت میں نہیں دیکھا۔ زندگی گزارنا ایک فن ہے۔ اور زندگی کو برتا ایک سلیقہ۔ تم نادان بچے ہو۔ اور اس حقیقت سے نا آشنا کہ تحریکیں ابھرتی اور دم توڑتی رہتی ہیں۔ حکومت وقت کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ جن کے تحت بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی ناپسندیدہ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ وقتی طور پر یہ فیصلے عوام پر گراں ضرور گزرتے ہیں۔ لیکن ان کے دکن دور رس ہوتے ہیں۔"

وہ حکومتی زبان بول کر خاموش ہوتے تو شفی چلا کر سوال کرتا۔

"شاہ لالہ! یہ کیا مصلحت ہے کہ کبھی تو اپنے ذاتی مفادات کے لیے جذبہ جہاد سے سرشار انسانوں کو مجاہدین کہا جاتا ہے۔ اور کبھی مفادات کی فصل کٹ جانے کے بعد بیرونی سرمایے سے اپنی تجوریاں بھر لینے کے بعد انہیں دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے۔ دے عوام حکومتی فیصلے اور دور رس نتائج کا سوال تو معاف کیجئے گا۔ فقط اٹھ ہفتوں میں چار مرتبہ صرف پینڈول جیسی اہم چیز کی قیمت بڑھانے کے نتائج کو اگر آپ لوگ دور رس قرار دیتے ہیں۔ تو پھر آپ کی سوچ کا اللہ ہی حافظ ہے۔" شاہ لالہ کبھی کبھار تاؤ کھا جاتے۔

"نادان ہے نئی نسل۔" وہ اپنی سوچ پر اڑے رہتے۔

یوں۔ وہ آزاد روح اس سمت مقیم ہو گئی۔ جس سمت شاہ بانو کے کمرے سے ملتی اور پی چوپارے کا جھوٹا کھانا تھا۔ دریا کے پانیوں کی ابھرنی پھلتی پھری نظر آتی تھیں اور اونچے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں پکارتی تھیں کہ اے ہم نفس! ذرا آگے بڑھو کہ دوسری سمت اک دھلی دنیا آباد ہے۔

اجنبی مسمان کی آمد کے ساتھ ہی یہ پکار گہری اور طویل ہو گئی۔ انقلابی ذہن کا مالک شفی خوش تھا کہ عمر کے واضح فرق کے باوجود مسمان زبردست دوست دوست ثابت ہوا تھا۔



اپنے قیام کے پہلے ہی دن اس نے دیوار پر لگے کیلنڈر پر چند تاریخوں کے گرد باریک بببببببب سے گول دائرے بنائے اور رات جاگ کر گزاری۔ اس نے بہت کم گفتگو کی اور رات کے پچھلے پہر سے صبح صادق تک عبادت میں مصروف رہا۔

صبح زور اور سے اس کی بیداری عمل میں آئی۔ شفی اس کے لیے ناشتہ لے آیا تھا۔ اس کے خلوص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے نفاست سے تجنی ہوئی نرے کی جانب دیکھا اور انجالی کیفیت میں کلائی پر ان لمحوں کے ہلکے سے لمس کا احساس دل میں اتر آیا۔ جب ایک اجنبی ہاتھ نے زندگی سے معمور دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ ہولے ہولے لرزتے دل کے ساتھ۔ بک بک کرتی گھڑی کی سوئیوں نے ایک تخت سمت ہی بدل دی تھی تو کیا؟ ان ہی باتھوں نے اس اجنبی مسمان کے لیے یہ نرے بھی سجائی تھی؟ وہ شفی سے سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"بہت خوب دوست!" اس نے ہلکی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر کہا۔ "ناشتہ کس نے بنایا ہے؟"

"بانو آئی نے۔" شفی نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا۔ "ویسے تو وہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہیں۔ مگر کھانا بھی بہت اچھا بناتی ہیں۔"

"کیا۔ ہر روز سب کے لیے؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں جی۔" شفی نے بتایا۔ "اتنا وقت ہی نہیں ملتا۔ انہیں ہر وقت موٹی موٹی کتابیں پڑھتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی خاص مسمان آجائے تو پھر ضرور پکاتی ہیں۔"

اور بھولین میں کسی گئی شفی کی سچائی دل کے اندر اتر گئی۔

"یہ نہیں جانتے تم لوگ کہ کس ہکاوے میں آچکے ہو۔ چند مغادرہ ست عناصر تمہیں شطرنج کے مسوں کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔ سرحد میں قدرت کی متعین کردہ ہوئی ہیں۔ خدا نے انسانوں کو ذات کردہ برادری اور ملکوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ وہ عالم پناہ ہے۔ ہر آمر کو جانتا ہے۔ وہ اپنے حساب سے اپنا نظام چلاتا ہے۔"

"جی ہاں بے شک۔" شفی دلیل دینے میں کسی قسم کے تامل سے کام نہ لیتا۔ وہ عالم پناہ ضرور ہے۔ مگر افسوس کہ عالم اسلام کے لیے آج فیصلوں کی ساری طنائیں سودیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

اور صرف ہم لوگوں کی اپنی تالافتی اور بھٹے پن کی وجہ سے۔"

"تم لوگ محنت سے کوئی بھی عمل کرنا نہیں چاہتے۔ بس آسمان روزی چاہتے تھیں۔ حکومت وقت کو برا بھلا کہہ کر اپنی تالافتی پر پرو ڈالنا چاہتے ہو۔ کچھ بھی تو نہیں کرتے تم لوگ بہت ہو تو حکومت کی مخالف سمت چل کر سرفروشی کی بے کار مثال پیش کرنے کے فریب میں اپنی جان قربان کر دینے کو بہادری سمجھتے ہو۔" وہ طنز بولے۔

اور پھر۔ اس ستم گر مثال کے پیش کرنے پر صرف شفی کاہی نہیں۔ بقا محمد اور نور محمد جوال کا دل بھی رو رو کر فریاد کرتا۔

"خدا کے واسطے اپنی سوچ کے اس انداز کو بدل ڈالیے شاہ لالہ! کسی بھی قوم کے سینے پر تجنی ہوئی اسی ہزار قبروں کا وسیع مرغزار۔ مذاق نہیں ہوا اگر نہ۔ اس مرغزار کے اندر دفن ہو جاتی ہیں ناؤں کی تمام تر آرزوئیں باپوں کی آنکھوں کے خواب، سناگنوں کی چوڑیوں کی کھٹک اور یتیم بچوں کی خوشیاں اور پھر زندہ انسانوں کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی یہ تمام خلش جو انہیں چین سے جینے نہیں دیتی۔ سکون سے سانس لینے نہیں دیتی۔ کیا سیرازہ حیات کے اس قدر منتشر ہونے کے بعد بھی یہ طفل تسلایں یہ بیانات اور یہ اعانات قوموں کی زندگی کے ساتھ ایک مذاق نہیں؟ شاہ لالہ بھلا سوچ کا یہ کیا انداز ہے؟ جہاں آزادی کی پکار کو دہشت گردی کا اعلان کیا جاتا ہے؟ چنانچہ۔ شاہ لالہ کی شفی کے ساتھ کبھی نہ بنتی۔ اب جب کہ اک اجنبی مسمان کے شفی کے کمرے میں مقیم ہو جانے کا سوال تھا تو شفی نے اسے بخوشی یوں قبول کیا کہ یہ بھی شاہ لالہ کو چیلنج کرنے کا اک انداز تھا۔

”خاص مسمان؟ تو کیا۔ اس کا شمار بھی کسی خاص مسمان کے طور پر کیا جا رہا تھا؟“ اس کا ذہن الجھ گیا۔
وہ جو شخص حادثاتی طور پر اپنی زندگی کے ایک اہم مشن کی تکمیل کے لیے کل لالہ کی مدد لینے یہاں تک آیا تھا۔ اسے شاہ بانو کے دل میں خاص مسمان کی حیثیت سے تقدیر نے تو شامل کر دیا تھا۔ اس سے آگے وقت کی رضا کیا تھی؟ اس امر سے سب ہی لاعلم تھے۔

وہ بہت سکون کے ساتھ۔ اپنے وطن کے قصبہ بارہ مولا میں وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ جی رہا تھا۔ اس وقت کی نوجوان نسل کے برعکس اس کا ذہن ہرگز انقلابی نہ تھا۔ وہ سیدھی سادی پر سکون زندگی گزار رہا تھا۔ کتابوں میں اس کا تکی لگتا اور وہ اسی دنیا کا باسی تھا۔ گھر میں قدم سے معاشی تنگی تھی۔ بابا اسکول ماسٹر تھے۔ اگرچہ معاشرے میں وہ درمیانے سے ذرا کم درجے کے افراد میں شمار کیے جاتے تھے۔ تاہم ان کے خواب بہت بلند تھے۔ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر پروفیسر آف میڈیسن بنانے کے خواب۔ اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے وہ اسکول کے بعد رات گئے تک نیشن بڑھاتے جس کی وجہ سے ان کی نظر کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ان کا ارادہ مضبوط تھا۔ اس کے علاوہ گھر میں مانی تھی جنہیں بی بی کہا جاتا تھا۔ اور پھوٹی بہن کائنات۔

ماسٹر عبد الرحیم کا گھرانہ بس اتنے ہی افراد پر مشتمل تھا۔ اور۔ وہ بذات خود ماں جی جسے راج میر کہا کرتے اور بابا فقط راج کہہ کر بلاتے۔ بابا کے خواب کی تعبیر کے لیے دن رات کوشاں تھا کہ وقت نے اپنا چلن بدلا اور کشمیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

تحریک آزادی کشمیر راستے تو بن رہے تھے۔ لیکن اس راہ کے مسافر خدا جانے کیوں خاموش تھے؟ جب سولہ برس قبل تحریک کی ابتدا ہوئی تو یکایک ایک پوری نسل اس راہ میں کٹ مرنے کے لیے تیار ہوئی۔

اس شام دو ماسٹر عبد الرحیم کے ہمراہ سری نگر کے لالہ پورہ میں موجود تھا۔ جب انقلاب کا آغاز ہوا یہ چند دوستوں کی معیت میں گورنر ہاؤس کے راستے پر دھڑا دینے والا جو شیلے نوجوانوں کا ایک گروپ تھا۔ جو اس انقلاب کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ ماسٹر عبد الرحیم نے دیکھا۔ ان کا

راہنما وہ لائق طالب علم تھا۔ جسے ایک عرصے تک انہوں نے اخلاقیات، بھارتی اور انسانیت کا درس دیا تھا۔ وہ اپنے اسکول اور بعد ازاں کان کن کا زیر دست ڈیپوٹر تھا۔ انسانی مہذب اور فرمانبردار۔ لیکن اس وقت وہ اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ کمرہ رہا تھا۔

”ہمارے ان نام نہاد لیڈروں کے پاس صرف اور صرف بولنے کی طاقت ہے۔ وقت نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ عملی طور پر اور کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ تو اپنی زندگی کے ذاتی بھانوں پر قابو پانے کا فن نہیں جانتے۔ قوم کی راہنمائی بھلا کیا خاک کریں گے؟“

قریب سے بارہ روزہ محشر جیسے کاشتوں کا خون کیوں کر جو چپ رہے گی زبان بھر لو پکارے گا آتش کا اگر آپ اپنی تقدیر پھٹتا چاہتے ہیں اپنے لبو سے نئی تاریخ رقم کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ آئیے کہ آج سے ہم آپ کو نئے انقلاب کی نوید دیتے ہیں۔“

ماسٹر عبد الرحیم نے اسے پہچان لیا۔ وہ علی قدر تھا۔ بارہ مولا کا رہائشی اور ان کے دوست شیخ شہیر کا فرزند ارجمند۔ عملی زندگی میں ایک شاندار کیریئر جموڑ کر وہ انقلاب کی راہ پر چل نکلا تھا۔ اس کی آواز میں پکار تھی۔ آزادی کی پکار، انقلاب کی پکار اور وقت کے سب سے سچے جذبے کی پکار۔

اور اس پکار کے زیر اثر ماسٹر عبد الرحیم کے قدم بے اختیار اس کی طرف بڑھ گئے وہ کہہ رہا تھا۔

”ہماری بد قسمتی تو دیکھیں کہ ہمارے پاس تو کوئی لیڈر شب ہی موجود نہیں۔ البتہ جو ہیں وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے مفادات کی فصل کاشت کرتے ہیں۔ اور پھر ان کی آنسو والی تسلیس اقتدار کی مسند پر براجمان ہو جاتی ہیں۔ مفادات اور اقتدار کے بیچ منہج حار میں پھنسی ہوئی بے چاری قوم، دور کہیں بہت دور رہ جاتی ہے۔ یقیناً ہم لوگ بد قسمت ہیں۔ اس لیے کہ ایران میں انقلاب برپا کرنے والا آیت اللہ خمینی بارہ مولا کا رہنے والا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد یہاں سے ہجرت کر کے ایران گئے تھے۔“

مگر وہ ایرانی قوم کی تقدیر پلٹ گیا۔ اور ہم لوگ؟ اور ہمارے یہ آج کے دانشور، اساتذہ، وکلاء، سیاست دان، علماء اور وزراء کے علاوہ حکمران وقت۔

ہم سب مل کر کیسی تاریخ لکھ رہے ہیں؟
کیا ہم سب یہ سمجھ لیں کہ برسوں سے جاری ہمارے آباؤ اجداد کی شہید کردہ تحریک آزادی ایک بے معنی مقصد کے علاوہ اور کچھ نہیں؟ یاد رکھیے۔ جوصلے صرف ان کے نونٹے ہیں جن کے ارادے مضبوط نہیں ہوتے۔ اپنے ارادے مضبوط کیجیے۔ اور آگے بڑھیے۔ اپنے جوصلے کو بلند کیجیے کہ منزل بالکل سامنے ہے۔“

ماسٹر عبد الرحیم نے آگے بڑھ کر علی قدر کو گلے لگایا۔

تحریک کی ابتدا ہو چکی تھی۔
ان ہی دنوں بارہ مولا کی ایک سردشام میں وہ بغیر اطلاع کے ماسٹر عبد الرحیم کے گھر چلا آیا۔ دستک کی آواز پر بی بی نے دروازہ کھولا۔ اور چوہے کے قریب بیٹھی ہوئی کائنات کے سفید مٹی کی روٹیوں کے اور نیچے ترنگتے ہاتھ رک گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظریں دہلیز کے اندر بنے چوہے کی چلتی گھاتی ٹک کے شعلوں پر پڑی اور پھر پلٹ نہ سکی۔

وہاں تو بلاشبہ ایک دنیا روشن تھی۔ چہرے کے بھولہن میں زندگی کے تمام رنگ نمایاں تھے۔ جھکی ہوئی جگلوں کا رخسار۔ سلیہ کیے وہ کام میں مصروف تھی۔ علی قدر کا قیام صرف ایک رات کا تھا۔ لیکن وہ رات اس کی زندگی کا راست بدل گئی۔ اس کے بعد علی قدر بار بار آنے لگا۔ اور اس آمد و رفت نے اس کی راج میر کے ساتھ دوستی مضبوط کر دی۔ اگرچہ علی قدر وحشت کے راستوں کا مسافر تھا۔ اس کی زندگی صحرائی لامحدود مسافتوں کا سفر تھی۔ اس کے باوجود جب وہ اپنی ماں کے ہمراہ کائنات کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کی درخواست لیے آیا تو ماسٹر عبد الرحیم اور بی بی انکار نہ کر سکے۔

راج میر کے ساتھ اس کی دوستی رشتے داری میں بدل گئی۔ اور اپنی زندگی کے اس پہلو سے مطمئن ہونے کے بعد وہ نہایت اطمینان سے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے کام کرنے لگا۔ جس کا آغاز اک جہاز کی صورت میں ہو چکا تھا۔

البتہ۔ کبھی کبھار نہایت سادگی سے اپنی تعلیم میں مگن راج میر اسے سمجھاتا۔

”یار! کیا قاعدہ ایسی باتوں کا۔ یاد رکھو! انسان اپنی تقدیر سے کبھی نہیں لڑ سکتا۔ اگر تقدیر میں بھی لکھا ہے تو ہمیں راضی ہو کر رہنا چاہیے۔“

اور جواب میں علی قدر اس کی کسی بھی دلیل کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ کہتا۔

”تم بھول رہے ہو میرے دوست! کہ بے شک انسان اپنی تقدیر کو تدبیر سے بدل سکتا ہے۔ رہی بات میرے مشن کی تو بذات خود بندوق ہاتھ میں اٹھانے اور دوسروں کے پکڑانے میں بڑا فرق ہے۔ ہم نے حالات سے مجبور ہو کر اپنے اس جہاد کا آغاز کرتے ہوئے بندوق اٹھائی ہے۔ ہمیں یہ ہتھیار بھینکنے پر مجبور نہ کرو۔“

وقت گزر رہا تھا۔ راج میر علی قدر کو قائل کر رہا اور نہ ہی علی اپنے مشن سے پیچھے ہٹ سکا۔

یہاں تک کہ ایک رات ماسٹر عبد الرحیم کے آنگن میں آن رکی۔ کشمیر میں جائزے کا آغاز تھا۔ اور نمٹنی چاندنی نے بارہ مولا کے دروازے پر روشن کر رکھے تھے۔ قصبے میں اس رات کچھ لوگ ہوئی کا تھوار منارہے تھے کہ رگوں کی اس برسات کے بیچ چھپنا چھپنا ہوا علی قدر ماسٹر عبد الرحیم کے گھر پناہ کی تلاش میں پہنچ گیا۔ شمالی کشمیر کے راستوں پر رواں دواں ایک فوجی قافلے پر گیا کیا حملہ کامیاب قرار دیا گیا تھا۔ مجاہدین کے ایک گروپ نے اپنے اس ہدف پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے تھے۔ اور قافلے کے گمانڈو سمیت کئی افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ علی قدر کے ہاتھ کچھ اہم دستاویزات لٹ چکی تھیں۔ جن کی مدد سے حکومت وقت کو انتہت پہچانا کچھ مشکل نہ تھا۔ علی قدر ان اہم دستاویزات سمیت پناہ کا طالب تھا۔

راج میر ان دنوں اپنے امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں گھر پر ہی مقیم تھا۔ وہ ماسٹر عبد الرحیم کے ساتھ علی قدر کو بھوسے والی کوٹھری میں چھپا کر باہر آیا تو کائنات اور بی بی نہایت خوفزدہ کھڑی تھیں۔ گھر کی طرف آنے والے راستے پر حساس اداروں کی گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ جنہوں نے چند ہی لمحوں میں سارے قصبے کے ساتھ خصوصی طور پر ماسٹر عبد الرحیم کے گھر کا احاطہ کر لیا اور اک خون آشام رات بارہ مولا کے اس قصبے پر چھا گئی۔

علی قدر گرفتار ہو چکا تھا اور پناہ دینے کے الزام میں ماسٹر عبد الرحیم کا سارا گھرانہ زیرِ عتاب تھا۔ برآمدے میں لکڑی کے ستونوں کے ساتھ بندھے ہوئے ماسٹر صاحب اور راج میر کا وجود رہائی کا طالب تھا۔ جب کہ انسان نماورندے ان پر ضربات لگانے میں کسی بھی قسم کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔

ظلم اور بربریت کا یہ کھیل جاری تھا کہ کیپٹن پر کاش اندر چلا آیا۔ اس کی نظر کائنات پر پڑی۔ وہ بی بی کے بازو سے لگی ڈری سہی کھڑی تھی۔ ڈر اور خوف کی شدت سے ہلکورے لیتا ہوا اس کا نازک سا وجود چاندنی میں چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں خوف کے سائے تھے۔ اور پلکتے ہوئے گالوں پر آنسوؤں کی برسات سرخ ہو نہ لڑ رہے تھے۔ فریاد کناس تھے۔ اور کانپتے ہوئے گورے گورے ہاتھ ہلاتی انداز میں سامنے کھڑے کیپٹن پر کاش کے سامنے فریادی تھے۔

”معاف کر دیجیے ہمیں۔ معاف کر دیجیے۔“

آوا کیسا دل سوز منظر تھا۔ کیپٹن پر کاش نے مہری سانس لی۔ وقت نے اسے کتنا تھکا دیا تھا۔ صبح و شام دن رات بھاگ دوڑ کرتے ہوئے وہ اپنے آپ سے۔ وقت سے اور انسانیت کی تمام حدود سے دور آگے جا چکا تھا۔ آج اس چھٹی چاندنی میں اس فریادی وجود نے اسے اخلاق انسانیت اور مذہب سب کچھ بھلا دیا۔ وہ اس وقت ایک ظالم آقا بن گیا۔ بے بس رعایا کا ایک ایسا آقا جو رحم کی سرحدوں سے دور بہت دور معصوم اور بے بس کائنات کو ظلم اور بربریت کے سمندر میں ڈبو گیا۔ بی بی جان راج میر اور ماسٹر عبد الرحیم کی کل کائنات لٹ گئی۔

راج میر کی آنکھوں کے سامنے وہ چلائی رہی۔

”بھائی! خدا کے واسطے مجھے بچاؤ۔“

”بھائی بھائی بھائی“

اور مجبور و بے بس راج میر کچھ نہ کر سکا۔ بند آنکھوں کے ساتھ روتا رہا۔ چلا تا رہا۔ اور اس رات۔ کائنات روتے روتے ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ صبح ہوئی۔ سورج بادشاہ ہمیشہ کی طرح قصبے پر روشنی بکھیرتا ہوا آن پہنچا۔

ماسٹر عبد الرحیم کے ذاتی کاغذات میں سے اہم دستاویزات کی برآمدگی نے مزید فرو جرم عائد کر دیا۔ انہیں علی قدر کے ساتھ انٹروکیشن سینٹر منتقل کر دیا گیا۔ اور بی بی کے بے ہوش وجود کے ساتھ راج میر کو کائنات کی لاش کا تحفہ دے کر کیپٹن پر کاش لوٹ گیا۔

شر قموشاں میں درودی رات اتر آئی۔ بے ہوشی کی کیفیت سے پلٹ آئے کہ بجائے بی بی کائنات کائنات پکارتی ہوئی بڑے طویل سفر پر روانہ ہو گئیں۔ ماں اور بسن کی قبر کی مٹی دونوں ہاتھوں میں لے

کر راج میر نے انتقام کی قسم کھائی۔ اور اس طرح زندگی نے اپنا رخ بدل لیا۔

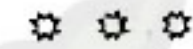
اس دن گایا ہوا ”علی قدر پھر بھی لوٹ کر نہ آیا۔“ ماسٹر عبد الرحیم شہید ضربات کی تاب فقط دو دن تک سہہ سکے۔ تیسرے دن کیپٹن پر کاش کے بھاری بوٹ کی صرف ایک ضرب عین دل کے مقام پر بڑا گہرا اور کاری وار کر گئی۔ اس ایک ضرب نے اخلاقیات اور انسانیت کا درس دینے والی زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ یہ تو کشمیر کے صرف ایک گھر کی کہانی تھی۔ حالانکہ تقدیر نے وہاں ہر گھر کو ایک نہیں۔ ایسی سینکڑوں ہزاروں کہانیوں میں بدل دیا ہے۔ ان کہانیوں کے کردار بڑے مگرے، بہت پر اسرار ہیں۔ بہت دکھی اور بے حد مظلوم بھی۔

چنانچہ راج میر وقت کے ساتھ تحریک آزادی کشمیر کے حامی لوگوں کے سامنے ایک مجاہد اور مخالف انسانوں کے گروہ کے سامنے ایک وہشت گرد کے طور پر سامنے آیا تھا۔ اب وہ ملی قدر کے اس گروپ کا ایک با اختیار رکن تھا جو انڈین آرمی سے ملی قدر کے خون کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ وقت نے اس کی شخصیت بدل دی تھی وہ صلہ جو اور امن پسند انسان کے طور پر راج میر بن کر امن اور سکون سے جینا چاہتا تھا۔ لیکن وقت کی دودھاری تلوار نے اس کی اس شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے پروفیسر مرشد حسین سید بنادیا۔ وہ میڈیسن کی تعلیم تو مکمل کر چکا تھا۔ تاہم ملی زندگی کے آغاز پر ہی زندگی نے اپنا راستہ بدل لیا۔ گروپ کے سب ہی کارکن اسے پروفیسر کہہ کر پکارنے لگے۔ اور حالات و واقعات نے ایک سیدھے سادے امن پسند ریاستی شہری کو حق بات کہنے والوں کی نظر میں ایک جہادی اور دورانی پالیسی رکھنے والے حکمرانوں کی نظر میں ایک وہشت گرد بنادیا۔

راج میر نے پروفیسر مرشد حسین سید بن کر جب اپنی تنظیم کی طرف سے مقرر کردہ ایک اہم ہدف کو نشانہ بنانے کے بعد پہلی بار سرحد عبور کی تو بالکل اتفاقی طور پر اس کی ملاقات گل لالہ سے ہو گئی۔ وہ ان دنوں ”کشمیر گارڈ“ کے لیے اپنی تنظیم کی رکنیت سازی کے لیے معصوف تھا اور شاہ کوٹ سے ذرا آگے سرحدی علاقے میں ایک خفیہ مقام پر رہائش پذیر تھا۔ مرشد حسین سے ان کی ملاقات بقا محمد کے چھوٹے بھائی نے کروائی۔ جو اس علاقے کا رہائشی ہونے

کے باعث مجاہدین کے لیے ایک گائیڈ کے طور پر کام کرتا تھا۔ انتہائی خالص گل لالہ کا دل مرشد حسین کا دکھ جان کر رو دیا۔ وطن کا درد مشترک تھا جس نے اس دوستی کی بنیاد رکھی۔ وہ اسے اپنے ہمراہ شاہ کوٹ لے آئے اور ”تحریک آزادی کشمیر“ کے لیے اپنی ہر ممکن خدمات کی پیش کش کی۔ چنانچہ وقت نے دونوں ساتھیوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر متحد کر دیا۔

چنانچہ۔۔۔ آج اس وقت شفی کے کمرے میں بندہ گزین مرشد حسین سید اپنی ذات کو کئی خانوں میں بانٹنے کے بعد جب لیڈی ڈاکٹر شاہ بانو کے دل کی دلیلیز عبور کر کے تن پہنچا تو، استان کا لک نیا مس سانسے آیا۔



گل لالہ کی داپسی ہوئی۔ بقا محمد اور نور محمد حموال انہیں اسلام آباد سے لے کر واپس شاہ کوٹ پہنچے۔ راستے میں بقا محمد نے جملہ تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اور خصوصی طور پر مندر حسین شاہ کے رویے کی شکایت کی تو گل لالہ نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں کہا۔

”ایسا کرنا اس کی فطرت کا خاصا ہے۔ وہ اس امر سے باز نہیں آئے گا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

اک طویل عرصے کے بعد ان کی ملاقات مرشد حسین سے ہوئی تھی۔ لہذا گل لالہ کی بیتک میں اک خوشگوار تغزل جم گئی۔ شاہ لالہ تو ویسے بھی اپنی زندگی میں گمن تھے۔ گل لالہ نے اپنی آمد کے بعد تمام حالات کو سنہانے کا مد کرتے ہوئے اہل خانہ پر واضح کر دیا تھا کہ اب اس مہمان کو اجنبی نہیں۔ بلکہ گھر کا ایک فرد تصور کیا جائے۔ شفی نے یہ بات شاہ بانو کو بتائی تو ساتھ بیٹھی ہوئی بتول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اب وہ ابھی کہاں؟ یہاں کے کینوں کے دلوں میں گم کر چکا ہے۔“

شاہ بانو نے دکھی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ طنز مسکراہٹ سے ”شاہ بانو“ کے درو دیوار کی طرف دلچسپی تھیں۔ جہاں وقت عمر کے آخری سائے لڑ رہے تھے۔ بذات خود ہمیشہ دکھ کے سمندر میں تھینے والے شاید کسی کو بھی ساحل پر اترتا ہوا انہیں دیکھ سکتے۔

گل لالہ اندر چلے آئے۔ مؤدب انداز میں روایت کے مطابق شاہ بانو کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے خیمت

دریافت کی۔ بتول نے محض رسمی انداز میں سلام دعا کی۔ رسم بھائی۔ گل لالہ نے اپنی فطرت کے مطابق سادگی سے بتایا۔

”میرا ایک مہمان کچھ عرصے تک ہمارے ساتھ رہے گا۔ پر دسی ہے۔ اس پار سے آیا ہے۔ وقت آنے پر لوٹ جائے گا۔ میری التجا ہے کہ براہ کرم اس کی آمد کی اطلاع صفی کو نہ دی جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ حالات خراب ہوں۔ اگر ممکن ہو تو۔“ مگر بتول نے ان کی بات کاٹ دی۔

”وہ جانتے ہیں گل لالہ!“ ان کا اشارہ اپنے اس خدائے مجازی کی طرف تھا۔ جس نے آج تک انہیں اپنے بیچ پر بٹھانے کے قابل ہی نہ سمجھا۔ لیکن اس وقت وہ نہایت معتبر انداز میں ان کی وکالت کرنے کے لیے تیار تھیں۔ جو محض شاہ بانو کے لیے ایک انتقامی رویہ تھا۔ اور کچھ نہیں۔

”زندگی میں کچھ حالات و واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر مصلحت کا ردہ بڑا رہے۔ تو بہت بہتر ہوتا ہے۔ میں التجا کر رہا ہوں، حکم نہیں دے رہا۔ اگر آپ لوگ تسلیم کریں گے تو یہ سب کے حق میں بہتر رہے گا۔“

گل لالہ دھیمے لہجے میں اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد باہر چلے گئے اور چلتے چلے گئے اس نیچے ہوئی شاہ بانو کے ڈیرے کی برسوں پرانی خدمت گزار شاہ بانو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

شاہ بانو نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ کام میں معصوف ہاتھ کے ساتھ ساتھ آنکھیں رو رہی تھیں۔

”آپ۔؟ کیوں رو رہی ہیں؟“ شاہ بانو نے حیرت سے پوچھا۔

شاہ بانو نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر رقت آمیز لہجے میں مرگوشی کے سے انداز میں گویا ہوئیں۔

”ہمیں اس پردسی کی حفاظت کا ذمہ لینا ہوا۔ اس لیے کہ۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔“

”بولیں! شاہ بانو!“ شاہ بانو نے بے تابی سے کہا۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

”آپ نہیں جانتیں بی بی!“ شاہ بانو نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔

”یہی شاہ بانو کا حقیقی وارث اور مسکن ہے۔ ہم لوگ ہی اس کے ضامن ہیں۔ آج کا یہ پردسی مہمان کوئی غیر

نہیں بڑے شاہ جی کی ہمیشہ وہی بی بی جان کی اولاد ہے۔“
مارے حیرت کے شاہ بانو کے لب رسل گئے۔

اس انکشاف کے بعد اک گہری اور جلد چپ ہرست چھا گئی۔ رات بھیک چلی تھی۔ اور آدھی رات کا مسافر چاند درتے میں آن رکا تھا۔ جسبی شاہ بانو کے مسلسل اصرار پر شاہ ہمالی بتاری تھیں۔

”سب ہی کو یہ بات معلوم ہے بقامحہ نور محمد جموال میں اور گل لالہ جانتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ کئی برس بیت گئے کہ وضع داری کے اس زمانے میں بی بی جان بڑے شاہ جی کے مرید عبد الرحیم کی بے پناہ نظر کرم کا شکار ہو گئیں۔ عبد الرحیم کا ذریعے پر آنا جانا تھا۔ اوائل عمری کے زندہ جذبے دونوں جانب اپنا وار کر گئے۔ اگرچہ عبد الرحیم سید ذات کا تھا۔ تاہم شاہوں کی اولاد کا خاندان سے باہر بیاہ کر جانا اک ناممکن امر تھا۔

عبد الرحیم کی بار بار التجاؤں کے باوجود جب کوئی پتھر نہ پگھلا تو ایک شب عبد الرحیم نے چپکے سے بی بی کو ہمراہ لیا۔ اور سرحد عبور کر کے اس بار چلا گیا۔ شاہوں کے ذریعے پر صبح کا سورج اک کمرام برپا کر گیا۔ ہر سمت آنسو ہی آنسو تھے۔

مائی مکی نے دل تھام لیا۔ برسوں کی ریاضت اور عبادت پر ایک ہی شب میں پانی پھر گیا۔ لازمی بنی آؤدوں کی تلاش میں انجانے ہمسفر کے ساتھ مشکل راہوں کی مسافر ہو گئی۔ بارہ مولا میں مقیم رشتے داروں نے ان کے نکاح کی خبر پہنچائی، مگر شاہ جی تو اظہار لا تعلقی کر چکے تھے۔ البتہ مائی مکی اپنے جگر گوشے کو بھلا نہ پائیں۔ پورے برس کے بعد جب عرس کے موقع پر وہاں سے آئے ہوئے چند احباب نے خوش خبری کی اطلاع دی۔

تو بی بی جان کی یادیں دوتے دوتے مائی مکی اپنی آنکھوں کا نور کھو چکی تھیں۔ وہ بڑے شاہ جی کے حضور روئیں گزرا تھیں کہ بی بی جان کو معاف کر دیا جائے۔ مگر وہ خاموش رہے۔ جب وقت قریب آیا تو بڑے شاہ جی نے مجھے اور میری والدہ کو بی بی جان کی دیکھ بھال کے لیے کشمیر روانہ کیا۔ زاد راہ کے علاوہ انہوں نے ایک چٹ ماسٹر عبد الرحیم کے نام ارسال کی۔ جس پر نومولود کا نام ”مرشد حسین سید“ تجویز کیا گیا تھا۔ ماسٹر عبد الرحیم نے ان کی اس خواہش کا احترام کیا۔ البتہ وہ پہلو تھی کی اس اولاد کو پیار سے ”راج میر“ کہہ کر بلانے لگے۔“

شاہ ہمالی ذرا دم لینے کے لیے رکیں۔ شاہ بانو دم بخود سن رہی تھی برسوں پہلے جب وہ پہلی بار یہاں آیا۔ تو ہمیں اس کی کوئی پہچان نہ تھی۔ مگر نقد پر اس کی ایک نشانی کو سامنے لے آئی۔ نیچے گھالی پر بنے تنگ راستے پر اس کا پاؤں پھسلا۔ اور اس کے دائیں شانے پر زبردست چوٹ لگی۔ وہ پہلو کے تل گر ا تھا۔ اور جسم کا تمام تر وزن اس کندھے نے سار کر اسے مزید چوٹ لگنے سے بچا لیا تھا۔

گل لالہ کی ہدایت پر اس نے اس کے دائیں شانے کی مرہم مٹی کرتے ہوئے نور محمد جموال نے دیکھا۔ دائیں شانے کی چھٹی سمت چاند ستارے کا نشان نمایاں تھا۔ اس کی زبانی یہ بات بقامحہ تنگ پٹائی۔ میری والدہ تب حیات تھیں۔ میرے بتانے پر وہ چونک اٹھیں۔ انہوں نے رب رحیم کی قسم کھا کر انکشاف کیا۔ یہ مسافر کوئی اجنبی کوئی پردیسی کوئی مہاجر نہیں۔ یہ تو اپنے پرکھوں کی سر زمین پر اترا ہے کہ بی بی جان کا مرشد حسین سید ہے۔ اب یہ تو محض اتفاق تھا کہ اس مرتبہ اس کی آمد پر بقامحہ داداشت کم ہو جانے کی بنا پر اسے پہچان نہ سکا۔ اور وہ کئی دنوں تک ایک اجنبی کی حیثیت سے شفی کے کمرے میں مقیم رہا تاکہ شاہ لالہ کی نظروں میں نہ آ سکے۔“

”شاہ ہمالی!“ شاہ بانو نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آپ“ آپ سچ کہہ رہی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ وہ پورے وقوف سے بولیں۔ ”میری والدہ مرحومہ دایہ کا کام کرتی تھیں۔ مرشد حسین سید کی پیدائش ان ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ وہ اس امر کی شہادت دیتی تھیں۔ آپ یقین کریں۔ وہ کسی اجنبی جگہ پر نہیں۔ اپنے نخیال میں ہے۔ اپنوں کے درمیان۔“ شاہ ہمالی اس کے چہرے کا رد عمل دیکھتی رہیں۔

”اپنوں کے درمیان؟“ شاہ بانو زیر لب بڑبڑائی۔ ”بھلا ہم سب اتنی جلدی پہچان کے تمام پل عبور کر کے اس کے اپنے کب بن سکتے ہیں؟ شاہ لالہ اور شاہ بابر تو دونوں اس کے دشمن ہیں۔ دشمن اپنے اندر کی دنیا کو فتح کرنے کی جدوجہد میں مصروف یہ لوگ؟ اپنے سے باہر کی دنیا کے نیسے والے انسانوں کے دکھ درد نہیں جان سکتے۔ اور نہ ہی ان کی قدر پہچان سکتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے شاہ ہمالی پہچان کے یہ پل کہیں کسی کی ذات کے لیے منگے نہ پڑ جائیں۔“

”اللہ مالک ہے بی بی!“ شاہ ہمالی نے اتنا کہہ کر گویا بات ختم کر دی۔ لیکن اصل بات تو اب شروع ہوئی تھی جب

روایتی پاسداری کا احترام کیے بغیر شاہ بانو، شفی کے کمرے میں اس مسمان کے قیام کا راز جاننے چلی آئی۔ شفی اس وقت گل لالہ کی بیٹھک میں موجود تھا۔ شاہ بانو نے دیکھا۔ دیوار پر لگے کینڈر پر چند ایک تاریخوں کے گرد سیاہ دائرے بنے ہوئے تھے۔ اب کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی۔ عین ان ہی تاریخوں میں وطن عزیز کے مقبوضہ حصے میں کسی نہ کسی کارروائی کا آغاز عمل میں آیا تھا۔ گویا کہ جانثار اپنے مرشد کی عدم موجودگی میں بھی پوری طرح سرگرم عمل تھے۔ کینڈر کے خالی حاشیہ پر ساغر کا شعر لکھا ہوا تھا۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کنی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یا نہیں
چادر کی بھل کیے ہوئے شاہ بانو، گل لالہ کی بیٹھک کی سمت آگئی۔ قدم کہ بے اعتدال ہو چلے تھے ترک نہ سکے۔ چوہنی درستی کے ساتھ لگ کر اس نے دیکھا۔ وہ گل لالہ، شفی، نور محمد، جمال اور بقا محمد کے ساتھ بیٹھک میں موجود تھا۔ شاہ بانو کا دل بھر آیا۔ وہ جو بظاہر لاوارثی کا لبادہ اوزر سے یرملا آیا تھا۔ کیا اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ وہ تو وارث تھا اس سرزمین کا۔ شاہ بانو کے اس گھرانے کا۔ اور اپنی اس جائے پناہ کا۔ شاہ بانو مسموت کھڑی رہ گئی۔ وہاں سب ہی ہمہ تن گوش تھے۔ اور مرشد حسین سید کہہ رہا تھا۔

"وقت سے نوٹ کر کرتے ہوئے اس لمحے نے جب میری زندگی کا راستہ بدل دیا تو پھر بھی سب ہی کچھ اسی طرح اور گرد موجود تھا۔ مگر زندگی میں چین و سکون نہ تھا۔ میری خیندیں رونہ چکی تھیں۔ اور میری ذات کے چاروں طرف بس ایک سی یاد تھی۔"

"بھائی! بھائی! مجھے بھلاؤ۔"

یہ پکار ہرل میرا پیچھا کرتی۔ ہر لمحے مجھے آوازیں دیتی۔ اور میں بے قرار ہو جاتا۔ ذرا اک سکون کی خاطر جب بھی آنکھیں بند کرتا۔ کائنات کا چیخا چلاتا ہوا سراپا میرے سامنے آن موجود ہوتا۔ بی بی کی رحم کی دہائیاں دیتا ہوا وجود مجھے آوازیں دیتا۔

"انتقام، مرشد حسین سید، انتقام میں بے چین و بے قرار ہو کر شہرِ موشاں کی طرف جان لٹا۔ اور وہاں پر موجود ہر قبر کا کتبہ چلا چلا کر فریاد کرتا۔

اپنی ذات کا انتقام لینے اور آزادی کی راہ پر چلنے والوں یا درکھنا۔ ہماری رو میں بھی تمہارے لیے دعا گو ہیں۔ میں

اپنے آپ کو مطمئن کرنے، اپنے اندر کی نوٹ پھوٹ کو سمیٹنے کی ناکام کوشش میں ہر سمت بکھر گیا۔ میرا وجود زندگی اور انتقام کے درمیان معلق ہو گیا۔ میرے اندر کی یہ پکار بڑی سرکش تھی۔ بڑی شدید تھی۔ میں اس کے کاری اثرات سے بچ نہ سکا۔ اور میں نے ایک فیصلہ کر لیا کہ اپنی پرکاش کے قتل کا فیصلہ۔

اور۔۔۔ میرے اس فیصلے کو تقویت اس وقت ملی جب کہ عرصہ دراز کے بعد علی قدر کی مسخ شدہ لاش باندی پورہ کے قصبے میں واقع ایک قبرستان کے احاطے سے ملی۔ آزادی کا بالکل جائز حق طلب کرنے کی پاداش میں اس کے ہاتھ پاؤں تو ذکر جسم کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے خون آلود ماتھے پر ایک پنی چسپاں تھی۔ جس پر کیپٹن پرکاش کی طرف سے حریت پسندوں کے نام یہ پیام درج تھا۔

"دیکھ لو۔ کہ ہم آزادی کا نام لینے والوں کا بالکل ایسا ہی حشر کریں گے۔"

میری تحریک کے اکثر لوگوں کے حوصلے جواب دینے لگے۔ ان میں شعور اور بیداری کا عمل کمزور پڑنے لگا۔ میرے کشمیر میں چند نام نہاد بھی لیڈروں نے اس جہاد کو دہشت گردی کا نام دے کر حکومت وقت کو خوش کرنا چاہا۔ اب میرا مجرم کیپٹن پرکاش تھا۔ وہ میری کائنات اجازت کے بعد میرے مشن کی تکمیل میں شامل لوگوں کے حوصلے پست کر کے مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ چنانچہ فیصلے پر عمل درآمد کا سوچ لیا گیا۔

کشمیر میں ہمارا کی آمد تھی۔ اور وادی کا حسن ہر سمت ہمار بن کر پھیل چکا تھا۔ کیپٹن پرکاش اپنی چاروں کی بیانی ہوئی دامن کو لے کر وہی سے سری نگر پہنچا۔ اپنی نئی زندگی کے آغاز پر خوشی کے سارے رنگ اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ اپنے پہلو میں دھان پانی سی دامن کو لیے ہوئے وہ ہری تنگہ ہائی اسٹریٹ میں واقع اپنے چچا کے گھر کے بیرونی گیٹ پر اترا۔

میری آنکھوں نے اس کی خوشی کا اک اک بل اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اندر کی سمت جاتے ہوئے اس نے جبک کر اپنی دامن کے کان میں سرگوشی کی۔ دھنک کے سارے رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ اور میری آنکھوں کے سامنے چینی چلائی ہوئی کائنات آن کھڑی ہوئی۔

"بھائی! مجھے بھلاؤ۔ بھائی! بھائی!"

میں اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش میں بہت پیچھے رہ گیا۔ اور پرکاش کا وجود دروازے کی دوسری سمت غائب ہو گیا۔ ہمارے مجر کی اطلاع کے مطابق دوسرے دن اس کی گھر گ کے لیے روانگی تھی۔ جہاں وہ ہنی مون مناتے ہوئے زندگی کی ساری خوشیاں کشید کرنے کا خواہاں تھا اب میرا سفر بھی پرکاش کے ساتھ ساتھ تھا۔ اپنی تقدیر سے بے خبر پرکاش دوسری شب گھر گ کے ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں مقیم اپنی دامن سے کہہ رہا تھا۔

"کوٹلیا! زندگی کتنی حسین شے ہے۔ بے حد خوبصورت بالکل تمہاری طرح۔"

گھر گ میں اس شب آسمان پر بادلوں کا راج تھا اور سمن کرج کے ساتھ برستی بارش کے دل فریب سماں میں اپنی زندگی کو پہلو میں لیے ہوئے کیپٹن پرکاش بالکل میری نظروں کے سامنے برآمدے میں موجود تھا۔ وہ اس وقت اپنے ظلم اور جبر کی دنیا سے دور ہمار کی کائنات کا باسی تھا۔ اس کے چمکے نقوش والی دامن خوش تھی۔ بے حد خوش کہ کیپٹن پرکاش کا پیار پا کر اس کی کائنات نھل ہو چکی تھی۔

ایک ایک میرا دل بھر آیا۔ انسان کس قدر بے بس اور مجبور ہے۔ اور اپنی تقدیر سے بے خبر بھی۔ کوٹلیا بھی بے خبر تھی کہ زندگی کے جن گھوم کو وہ اپنی دنیا سمجھ رہی تھی بل بھر میں وہ دنیا میرے ہاتھ کی انگشت شہادت سے پلٹ جانے والی تھی۔ وہ دونوں میرے سامنے موجود تھے۔ اور پستول پر میری گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔

میرے کانوں نے ٹیلی کی آوازی سنیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کشمیر کی اس وادی میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے آپ لوگ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہیں یہ کوٹلیا نے بات ادھوری نہ چھوڑ دی۔"

"تم فکر نہ کرو۔" پرکاش نے بے ساختگی سے قہقہہ لگایا۔ "میں سو سال جیوں گا۔ تمہارے سنگ رہوں گا۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" کوٹلیا کہہ رہی تھی۔ "یہاں تو ہر سمت خوف کا راج ہے۔ دیکھیے نا اس شب کی تاریکی میں یہ برستی ہوئی بارش اور گرہا ہوا آسمان کیا خوف کا سماں سامنے لا رہے ہیں پرکاش! میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔"

"کیوں بھلا؟" پرکاش نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "میں ہوں نا تمہارے ساتھ"

میں سامنے کھڑا اسے دیکھتا رہا، لیکن وہ اس وقت ساری دنیا سے لاتعلقی کوٹلیا کے ساتھ اپنی ہی دنیا میں گمن کہہ رہا تھا۔ "تم تو میری زندگی ہو۔ میری کائنات میری اپنی۔"

گمراہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

عین اسی وقت میرا دل چٹایا۔

تو۔۔۔ میری کائنات کہاں تھی؟ میری معصوم کائنات۔ منوں مٹی تلے سونے والی میری تڑپا، میری بسن! اور۔۔۔ پھر میری انگشت شہادت نے اپنا کام کر دکھایا۔ گھمکی اس کی پیشانی پر لگی تھی۔ کوٹلیا خوف اور گھبراہٹ سے چلائی ہوئی اس پر جھک گئی۔ وہ لڑکھڑا کر بڑا، دوسری گھمکی اس کے دل پر لگی۔ جہاں اس وقت آرزوؤں کا اک جہان آباد تھا۔ لیکن اس وقت کوٹلیا کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ اور وہ میری نظروں کے سامنے پرکاش کے بے جان جسم سے پلٹ کر رو رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔

اپنی چاروں کی بیانی دامن کے سنگ سو سال تک بیٹنے کا عہد کرنے والا کیپٹن پرکاش اس لمحے زندگی سے بہت دور جا چکا تھا۔ برستی بارش کی بو چھاڑ اس کے مرہ جسم کو بھگور رہی تھی۔ اور کوٹلیا کے آنسو اس بارش کے سنگ سنگ برس رہے تھے۔ آسمان پر اس سے بادلوں کی گھن گرج جاری تھی۔ گھر گ کی یہ رات بہت تاریک تھی۔ کسی سمت روشنی کا کوئی نشان نہ تھی۔ میں وہاں سے لوٹ آیا۔

اس شب کی برستی بارش میں میرا بیگ ہوا وجود کسی پناہ گاہ کا طالب تھا۔ اب تحریک کا ہیڈ کوارٹر میرا مسکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اگلے چار دن تک میں کشمیر کے ایک مضافاتی علاقے میں رو پوش رہا۔

حکومت وقت میرے سر کی قیمت مقرر کر چکی تھی۔ میرے پاس وہاں سے فرار کے علاوہ اور کوئی راستہ ممکن نہ رہا۔ جب میرے قدم اس راستے پر چل نکلے تو انجانے میں نہیں بلکہ دانستہ میں یہاں چلا آیا۔ اپنا سمجھ کر دوست جان کہ شاید پناہ کی تلاش میں۔ معلوم نہیں تقدیر اب کیا سمت دکھائی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میری عدم موجودگی کہیں میرے ساتھیوں کے حوصلے پست نہ کر دے۔ انہیں اپنے مقصد سے دور نہ لے جائے۔ بس یہی خلش ہے۔ یہی پرچنی ہے۔"

مرشد حسین سید نے اپنی بات ستم کی تو گل لالہ نے دیکھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ آگے بڑھ کر گل لالہ نے اس کی آنکھوں سے بے آنسو پونچھ ڈالے۔

نہیں ہوتے۔" وہ بولیں۔ "بڑی ہونے کے ناتے سمجھنا میرا فرض ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔" وہ پلٹ کر ہانپ کر نکلیں۔

"انسان اپنے مفادات کے لیے کس قدر خود غرض ہوتا ہے۔" شاہ بانو نے سوچا۔ "میری ذات کے ساتھ طنز کا رشتہ پیدا کرنے اور شاہ باہر کی وکالت کرنے سے پہلے بتول بی بی آخر یہ کیوں نہیں سوچیں کہ شاہ بانو کی اس مقدس سرزمین پر موجود مقدس مزارات کی موجودگی میں سرشام تمام تقدس کو فراموش کرتے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ محفلیں سجانے والا ان کا لاڈلا شاہ باہر آخر کس کا مجرم ہے۔ بزرگوں کا مذاق اڑانے والا شاہ باہر کس کی شہ پر کس طرح شاہ بانو کو بلاوجہ اذیت دیتا رہتا ہے؟ اور بذات خود ان کی اپنی ذات کو مسلسل اک جہنم میں جھونکنے والے شاہ بانو کس قدر انصاف پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ اپنی شکستہ آرزوؤں کی پامالی کا بدلہ وہ مجھ سے کیوں لیتا چاہتی ہیں؟ آخر کیوں؟" وہ کڑھتی رہی۔

بست سے دن گزر گئے۔ شہر سے بار بار بس آیا ہی چاہتا تھا کہ استحقاقات بست قریب تھے وہ ہمیشہ کی طرح مصروف تھی، لیکن ذہن اب کی بار بست منتشر تھا۔ عصر کے بعد وہ مانی مکی کی درگاہ کے عقب میں چلی جاتی۔ جہاں چھوٹے سے قطعہ کی صفائی کرنے کے بعد شاہ بانو اس کے لیے فرشی نشست کا اہتمام کر دیتیں۔ اور شاہ بانو کے قریب بیٹھ کر خاموشی سے کڑھائی کا کام کرتیں۔ مغرب کا وقت قریب آتا۔ تو وہ دونوں اوپر چوٹی میں واپس آ جاتیں۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران شاہ بانو کا یہی معمول تھا۔

وہ ایک انتہائی سردشام تھی۔ ٹھنڈی ہو اسامیں سامیں کی آواز کے ساتھ وادی میں اپنے ہونے کا احساس دلاری تھی۔

بادل چڑھ کے درختوں پر جھک آئے تھے۔ بس کچھ ہی دیر بعد برسنے والی بارش کا سماں تھا۔ شاہ بانو قصبے کی دکان سے کڑھائی کے لیے دھانے لینے جا چکی تھی۔ شاہ بانو نے اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے شاہ باہر کے ذریعے کی طرف دیکھا۔ وہاں آج خلاف معمول خاموشی تھی۔

شفعی نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پشاور کی دوستوں کے ہمراہ سوات گیا ہے۔ اس کی فیر موجودگی میں شاہ بانو کو بیٹھ اسن

خوش گانیں کسی کو بھی۔ کیا سمجھتے ہیں آپ لوگ؟" وہ بکلا جھٹکا شفی کے ہمراہ نیچے ڈیرے پر چلا گیا۔

شفعی کے علاوہ باقی سب بھی جان چکے تھے کہ وہ اس وقت اپنے حواسوں میں نہ تھا اکثر کسی شام وہ بے تحاشا پیتا تھا اور سبک جاتا تھا۔

شاہ بانو بھی یہ بات بخوبی جانتی تھی۔ سرد ہوا سے اس کا خوف زدہ جسم لرز رہا تھا۔ درختے کا پتہ تھا وہ خاموش کھڑی رہی۔ کمرے میں گل لالہ کی شرمندہ آواز گونج رہی تھی۔ وہ مرشد حسین سید سے شاہ باہر کے اس رویے کی معافی مانگ رہے تھے۔

"کوئی بات نہیں۔" اس کی آواز آتی۔ "ہم تو اس سے بھی زیادہ درشت رویے کے عادی ہیں۔ ویسے بھی پناہ گزین ہونا کوئی آسان امر نہیں۔ پرانی زمین غیروں کا زور بڑی مشکل سے برداشت کرتی ہے یہ تو اپنے وطن کا ظریف ہوتا ہے۔ صرف اپنے وطن کا کہ جس کا سینہ ہر قریش کے انسانوں کا بوجھ برداشت کر لیتا ہے۔"

"یہ سرزمین تمہاری اپنی ہے مرشد حسین! گل لالہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ہمیں اپنے آپ کو مضبوط کرنا ہوگا۔ بست مضبوط اگر ہم شاہ باہر جیسے نادان اور بے جس لوگوں کے خون کو اس طرح دل پر لینے لگے تو پھر نی نہ سکیں گے۔ ذرا سوچو اپنے اس عظیم راہنما کے بارے میں کہ جس کے عزم و جہم نے ہمیں یہ سرزمین بخشی کہ دنیا کے بنے بنائے نقشے پر ایک نیا ملک لانا ایک دشوار امر تھا۔ لیکن وہ یہ کر گزرے کہ ان کا مقصد عظیم تر تھا۔ تم یہاں امان پاؤ گے۔ یقیناً تم اپنے رب کی پناہ میں ہو۔" گل لالہ نے اسے تسلی دی۔

"بڑی مہربانی بہت بہت شکریہ۔" مرشد حسین نے کہا۔

گل لالہ نے اسے آرام کرنے کی ہدایت کی اور بقاعمر سے اس کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے نور محمد جہاں کے ساتھ باہر چلے گئے۔ بست آہستگی سے چلتی ہوئی شاہ بانو چوٹی کے اندر تک آئی تو بتول کی جھمکی نظریں اس کے لرزتے ہوئے وجود کے اندر تک اتر گئیں۔

شاہ بانو اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش میں کمرے کے وسط میں کھڑی تھی کہ وہ عین اس کے سامنے آ گئیں۔

"آپ سے کھیلنے کی کوشش میں یہ مت بھول جانا کہ اگر وہاں سے چلے ہوئے بدن کے زخم زندگی بھر مندمل

اس پر تو قربان ہو جانے کا دل چاہتا ہے۔" شاہ باہر! گل لالہ کی آواز بلند تھی۔ "بہتر ہے کہ تم میرے معاملات میں دخل نہ دو۔"

"یہ تو ممکن ہی نہیں گل لالہ! وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "جب ہمارا خون ایک ہے تو پھر بھلا ہمارے معاملات الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں۔ ورنہ۔" وہ چلائے۔ "ورنہ کیا گل لالہ! کیا کر لیں گے آپ؟"

"شاہ باہر! تم۔" تم حد سے بڑھ رہے ہو؟" ان کا چہرہ مضطرب کی کوشش میں سرخ ہو رہا تھا۔

"کون سی حد بھائی صاحب؟" وہ اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے بولا۔

"یہاں تو کسی کے لیے بھی کوئی حد نہیں۔ لوگ تو سرحدیں عبور کر کے ہم تک آن پہنچے ہیں۔ اور آپ ابھی بھی اپنے اور میرے درمیان حدود متعین کرنے پر مہر ہیں۔"

"شاہ باہر! ہمارے یہاں ممانوں کا احترام کیا جاتا ہے۔" گل لالہ نے خاندانی روایات کی پاسداری کا احساس دلانا چاہا۔

"جی ہاں بے شک۔" وہ زہر آلود لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں احترام فقط ممانوں کا کیا جاتا ہے۔ مغمور بچروں اور درہشت گردوں کا نہیں۔"

اس سے پہلے کہ گل لالہ کا ہاتھ شاہ باہر پر اٹھ جاتا۔ نور محمد جہاں درمیان میں آیا۔

"رہنے دیجیے گل بادشاہ۔" اس نے پیار سے گل لالہ کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ انہیں پیار سے گل بادشاہ گنا کر رہا تھا۔ "بچہ ہے نا سمجھ ہے۔ آپ بات ختم کر دیجیے۔"

پھر اور شاہ باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "پھوٹے شاہ جی! آپ بزرگوں کا احترام کرنا کیوں بھول گئے؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھے احترام کا درس دینے والے۔" شاہ باہر نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ نور محمد جہاں نے کچھ کہتا چاہا مگر خاموش رہا۔

اب تک خاموش کھڑے شفعی نے آگے بڑھ کر شاہ باہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آپ آئیے میرے ساتھ! نیچے ڈیرے پر آپ کے ممان انتظار کر رہے ہوں گے۔"

شاہ باہر نے جاتے جاتے ہنسی دی۔ "آپ آئیں شاہ لالہ کو۔ سب کی شکایت گاؤں گا۔"

"تم یہاں تھا نہیں ہو میرے دوست!" انہوں نے کہا۔ "ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم اس سرزمین پر آزاد ہو۔ بالکل ہماری طرح۔ میرے اس وطن کا دل بست کشادہ ہے۔ بے انتہا کشادہ۔ ہم نے تو اپنے معاشرے کی خرابی کو نظر انداز کرتے ہوئے تیس لاکھ افغان باشندوں کو یہاں پناہ دی۔ تو کیا ایک مرشد حسین سید کو برداشت نہیں کر سکیں گے؟ رہا سوال کشمیر کا زکات و افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس وقت ہماری اپنی ٹانہوں کو تانہوں اور ضرورت سے زیادہ کسر نفسی کے باعث تحریک آزادی کشمیر دم توڑ رہی ہے۔ ہم نے جہاد کی سمت جاتے ہوئے اچانک اپنا راستہ بدل لیا۔ اور دوستی کی ہاتھیں کرنے لگے۔ اس امر کا احساس کیسے بنا کہ آج بھی ہزاروں شہداء کی روحیں ہمیں پکار رہی ہیں کہ خدا را جہاد کے اس مقدس جذبے کو اس طرح بچھڑھا رہے ہیں نہ چھوڑنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تاریخ کے اس دور پر ہم اپنے ہاتھوں میں کشتوں لیے کھڑے رہ جائیں اور تاریخ ہمارے واسن میں ماسوائے ہزیمت باہو سی ٹاکامی اور ذلت کے اور کچھ نہ ڈال سکے۔ لہذا ہمیں ان آزمائے ہوئے لوگوں کو اپنا نجات دہندہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ جو فقط اپنی حاکمیت اور برتری ثابت کرنے کے لیے دوسروں کے وطن تباہ کرتے رہے۔ وہی بات ان کی ہم سے غلوں محبت اور وفاداری کی۔ تو خدا جانے آج ہم یہ کیوں بھول گئے کہ ہمیں تو آج تک اس بحری بیڑے کا انتظار ہے۔ جس نے سابقہ مشرقی پاکستان کے کسی ساحل پر لنگر انداز ہو کر ہمیں سرخو کرنا تھا۔ لیکن حاصل کیا ہوا؟ محض ذلت؟ گل لالہ کی آواز بھرا گئی۔

اچانک ایک بلند قہقہے کی آواز پر وہ سب چونک گئے۔ بیٹھک کی ادلیز پر شاہ باہر کھڑا تھا۔

"بست خوب۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "بڑا زبردست تماشا ہو رہا ہے یہاں واہ کیا بات ہے۔"

گل لالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "شاہ باہر! انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ "رفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"واہ گل لالہ واہ۔" وہ نہایت بے ادبی سے مانی بجاتے ہوئے بولا۔ "جواب نہیں آپ کی دوغلی پالیسی کا۔" غیروں کو تو اپنی آغوش میں پناہ دیتے ہیں۔ یہ جانے بنا کہ اس کے نتائج کتنے بھیانک ہو سکتے ہیں۔ اور اپنی کو دفع ہو جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ واہ کیا زبردست پالیسی ہے کہ

آنسوؤں کی برسات میں بھیگا ہوا چہرہ دل کے راستوں کا مسافر ہو چکا تھا۔
”آپ سننا وہ رک رک کر بولی۔“ آپ کیوں رو رہے ہیں؟“

”آج ماں بہت یاد آئیں۔“ اس نے اعتراف کیا۔
”دل کی وحشتوں سے گھبرا کر جب یہاں چلا آیا تو اس مرقد پر سرنیک کر رونے کو دل چاہا۔ اور میں۔۔۔ اپنے دل کی بات بھی نہیں نالٹا۔“

شاہ بانو نے دیکھا۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ دکھ کی ایک داستان تھا۔

”یہ دنیا ہے۔“ اس نے مرشد حسین سید کو تسلی دینے کے سے انداز میں بات شروع کی۔ ”یہاں ہر شخص کو بالآخر ایک داستان بن جانا ہے۔ جانے والوں کو بھلانا مشکل ہی سہی پھر بھی آپ سے التجا ہے کہ اس طرح نہ روئے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کے یہ آنسو ہمیں بھی دھمی کر دیں۔“

مرشد حسین کے کانوں میں یہ الفاظ اترے اور وہ حیرت زدہ کھڑا رہ گیا۔

وقت عصر نے اک چاہت کا اعتراف کر لیا تھا۔
شام کے جھپٹے میں چیز کے گھنے درختوں سے گھری وادی تیز چلتی ہوئی ہو اور رباب کی مدھر موسیقی بکھیرتی ہوئی آواز کے پس منظر میں کھڑی اعتراف کی ساری حد عبور کر کے اک بے پناہ اپنائیت کا احساس دلانے والی شاہ بانو۔

مرشد حسین سید کی دنیا کا رخ ہی بدل گیا۔
شاہ بانو کی آنکھیں گواہ تھیں کہ وہ سچ بالکل سچ کہہ رہی تھی اور مرشد حسین سید کا دل راضی تھا بالکل راضی کہ شاہ بانو کے اس سچ کو قبول کر چکا تھا۔

اس قدر واضح اعتراف کے بعد شاہ بانو کی آنکھوں نے اپنے دل کی دلیز عبور کرنے والے اجنبی سے اتنا ضرور پوچھا۔

”آپ۔۔؟ آپ کون ہیں؟“
اور مرشد حسین سید کی بھگی ہوئی آنکھوں نے بڑے ہی دکھی لہجے میں رقت آمیز آواز کے ساتھ جواب دیا۔

”پناہ گزین، مہاجر، مجاہد یا پھر دہشت گرد۔ ہمیں تو اپنی حیثیت متعین کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ پھر بھی ہم آپ کے دل کے شہ پناہ میں بس گئے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے۔“

سکون اور تحفظ کا احساس رہتا۔ مگر اسانس لے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ بابر جو اس کی تقدیر بننے والا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ آنے والے وقت میں یہ شخص اپنی روایتی ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث تقدیر کے ساتھ مل کر اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ یہ بڑی اذیت ناک سوچیں تھیں۔ جو اکثر شاہ بانو کو پریشان کر دیتیں۔ اس وقت بھی ایسی ہی سوچ نے اس کی ذات کا احاطہ کر لیا تھا۔ لیکن اب اس سوچ میں مرشد حسین سید کا عکس بھی نمایاں تھا۔

وہ اپنا تو تھا۔ لیکن کیا عجب ستم ظریفی تھی کہ اس کی ذات کی طرف جانے والے تمام راستے ابجیبی تھے۔ اور۔۔ شاہ بانو کا دل چاہت کی پوری شدت کے ساتھ ان راستوں پر چلنے کا متقاضی تھا۔ یہ جانے بنا کہ صحرا کے اس سفر کی تو کوئی منزل ہی نہیں تھی۔ وہ چند قدم چلی اور پھر ہنہٹک کر رک گئی۔ اس وقت یہاں اس سنانے میں کوئی رو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز ہوا کی سائیں سائیں کے ساتھ شاہ بانو کے کانوں میں اتر گئی۔ پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم گردانا۔ لیکن جب آواز ذرا بلند ہوئی۔ تو آگے بڑھتے ہوئے شاہ بانو حیرت زدہ سی کھڑی رہ گئی۔

مائی مکی کی درگاہ پر عین ان کی قبر کے سرہانے بچے ہوئے چراغوں کی دلیز پر سر رکھے مرشد حسین سید رو رہا تھا۔ اس کا لمبا چوڑا وجود اس وقت بے تحاشا ہچکچوں کی زد میں تھا۔ اپنا چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپائے ہوئے خدا جانے کس دکھ کی چٹان تلے دبا ہوا وہ اپنے آنسوؤں کا نذرانہ اس مرقد کے حضور پیش کر رہا تھا۔

وادی میں چلتی ہوئی تیز ٹھنڈی ہوا کے سنگ سنگ آنسوؤں کی یہ برسات گہری ہوتی چلی گئی۔ اس کے بالکل سامنے شاہ بانو مبسوت کھڑی رہ گئی۔ اور سارا وقت ایک گہرے سنانے کی زد میں آگیا۔

اسی وقت کسی نے رباب کے تار پھیرے اور دل فریب موسیقی کی لہریں ہر طرف بکھر گئیں۔ اپنے کمرے کے چھوٹی برآمدے سے چلی ڈھلان کے راستے پر موجود پتھر ملی چٹان پر بیٹھا ہوا شفی رباب کے ان تاروں سے کھیل رہا تھا جنہوں نے اس سنانے میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ مرشد حسین نے اس آواز کو سنتے ہوئے اپنا سراور اٹھایا۔ اس کے بالکل سامنے شاہ بانو کھڑی تھی۔ اداس معصوم اور تنہا۔

اس مقدس اعتراف کے اس پل "شاہ بانو کی نظریں جھک گئیں۔"

اچانک رباب کے تار ختم ہوئے موسیقی کی لہریں ٹوٹ کر بکھر گئیں اور اس حسین منظر کو آنے والے خوف کے اس احساس نے نکل لیا کہ اونچے چوہارے پر سے چلا تے ہوئے نور محمد جہاں نے نیچے لنگر میں کام کرتے ہوئے بقا محمد کو مندر حسین شاہ کی آمد کی خبر دی۔ شاہ بانو کی نظریں نیچے دیر پر بنے ہوئے جھولتے پل پر جا رہیں۔ سفید جیب پر لگی سبز سیرپٹ کے لفظ اعلان کر رہے تھے کہ اب اس سرکاری سواری کی آمد "قریب" تھی جو شاہوں کے اس ڈیرے کا سکون عادت کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

بقا محمد بدحواسی میں استقبال کرنے باہر چلا آیا۔ نور محمد جہاں بھی تیز قدموں سے گھالی کے آخری موڑ کی طرف جا رہا تھا۔ جب کہ یہ خبر سنتے ہی شاہوں کے اونچے چوہارے میں بتول بی بی کا کانٹا ہوا وجود بھی سامنے آ گیا۔

شاہ بانو کا دل لرز گیا۔ اعتراف کے پل بیت چکے تھے اور اب آنے والے دنوں میں وحشت کا ایک دور سامنے تھا۔ اس وحشت کا احساس کرتے ہوئے شاہ بانو کی خوف سے کانپتی ہوئی آواز آئی۔

"آپ گل لالہ کے پاس بیٹھک میں تشریف لے چلیے۔ شاہ لالہ کی آمد ہو چکی۔ اب آپ کا باہر رکنا مناسب نہیں۔"

مرشد حسین سید نے سکون سے اس کی بات سنی اور پھر اس نے پہلی بار اس کا نام لیا۔

"شاہ بانو! میں اس طرح اپنیوں کے درمیان اپنی ماں اور باپ کی سرزمین پر قیدی بن کر نہیں رہ سکتا۔ مشکل ہے بہت مشکل۔"

اس انکشاف پر شاہ بانو چونک گئی۔ "تو کیا وہ سب کچھ جانتے تھے؟"

شاہ ہمالی کا بیان بالکل سچ تھا۔ اک جامع اور مکمل سچ۔ "تو کیا آپ؟" شاہ بانو نے کچھ کنا چاہا، لیکن مرشد حسین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں تو کیا۔ کوئی بھی انسان کبھی بھی اپنے آپ سے بے خبر نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ اور کب سے ہے؟ آپ حالات کو جاننے بنا اپنی زندگی کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ میں مرشد حسین سید بھی اپنے آپ سے اور اپنے حالات سے بے خبر نہیں ہوں۔"

"بس فقط چند دن اور۔" شاہ بانو نے معذرت کی۔ "شاہ لالہ کی اپنی الگ دنیا ہے۔ وہ لوٹ جائیں گے۔"

"مگر میں اس خوف اور وحشت کے عالم میں نہ تو خود زندہ رہ سکتا ہوں۔ اور نہ ہی آپ سب کو اس دکھ اور پریشانی میں جکڑ کر سکتا ہوں۔ آپ کی میزبانی کا شکریہ بہت شکریہ" شاید وہ بات ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بہت کچھ کنا چاہتے تھے۔ بہت کچھ سننا چاہتے تھے کہ مصلحت پسند گل لالہ ان کی تلاش میں اپنی بیٹھک سے نیچے کی جانب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ شاہ بانو کے لیے وہاں رکنا مناسب نہ تھا۔ اس نے کچھ کے پناہ پلٹ کر جانا چاہا۔ مگر گل لالہ نے سارا منظر دیکھ چکے تھے۔ وہ حیرت زدہ کمرے رو گئے۔

گل لالہ نے دیکھا۔ شاہ بانو تیزی کے ساتھ اوپر چوٹی کی طرف آ رہی تھی۔ تیز ہوا کی تیزی سے قطع نظر اس کا چہرہ شاید شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ رونا چاہتی ہے۔ مگر آنسوؤں کی یہ برسات اندر کی سمت جاری تھی کہ مرشد حسین سید کے لفظ گواہ تھے۔ وہ یہاں سے بھی جانا چاہتا تھا۔ "کیوں؟ آخر کیوں؟" دل کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ ان کی دوسری نظر مرشد حسین سید پر پڑی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ اٹھائے وہ مالی کی کے مزار کے سرہانے کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

گل لالہ کا دل بھر آیا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس سرزمین پر اجنبی نہیں۔ یہ سب لوگ اس کے اپنے ہیں لیکن وہ اس کا اعتراف نہ کر سکتا تھا کہ اس سرزمین پر اس کا بھی اتنا ہی حق تھا۔ جتنا شاہ لالہ اور گل لالہ کا تھا۔

مرشد حسین سید کو خبری نہ ہو سکی کہ گل لالہ اس کے عقب میں موجود تھے وہ اس کا بازو تھام کر چلتے ہوئے اپنی بیٹھک میں آ گئے۔ شاہ لالہ کی سواری حویلی کے مرکزی دروازے پر آن رکی۔

بقا محمد اور نور محمد جہاں نے ان کا سامان "شاہ بانو" تک پہنچایا۔ بتول نے اپنے وہ آنسو پونچھے۔ جو بیش کی صفی کی آمد پر عم یا پھر خوشی کا کوئی بھی جواز پیش کیے بغیر ان کی آنکھوں تک جاتے تھے۔ گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے برآمدے کی طرف دیکھا۔ اور سرسبز شام کا تاثر نمایاں تھا۔

شاہ بانو کتابیں ہاتھ میں لیے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ شاہ ہمالی آخری سرے پر بیٹھی رہی۔ دھماکے

سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ مگر کوئی بھی سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بتول بی بی نے ریشمی دھاگوں کے ہر انچ کو دیکھا۔ ہر سرعائیب تھا البتہ تمام رنگ نمایاں تھے۔ زندگی کے تمام رنگ۔

"شاہ بانو" کے اندر کی دنیا آج آباد تھی لیکن بتول بی بی کی زندگی کے دھاگے اسی طرح الجھے ہوئے تھے۔ جیسے روز اول سے نصیب بنے تھے۔ ریشمی تھوڑے فٹ سے بھر پور الجھے ہوئے کبھی سمجھ میں نہ آنے والے اپنے اندر کی جنگ جیتنے کی خواہش میں انسان اکثر ہار جاتا ہے۔

معاً ایک خیال بجلی کی طرح بتول کے ذہن میں کودا اور بڑی گہری گھر پر اسرار مسکراہٹ اس کے لبوں پر چھا گئی۔

شاہ لالہ۔۔۔ مندر حسین شاہ، معنی کو جیت لینے کا خیال بھلا کس طرح؟ اس کے لیے بھی ساری راہیں روشن تھیں۔

رات جب اپنے پہلے پیر کے ساتھ شروع ہوئی تو شاہ لالہ کلور بار برخاست ہو چکا تھا۔ شاہ بابر کی غیر حاضری مکمل لالہ کی ولایت سے آمد انجانے انجی کی براسرار آمد اور مستقل قیام کی باز پرس کے علاوہ وہ تمام ہی گھاتے کھول کر نور محمد جہاں کے ساتھ ساتھ بقا محمد کے صبر کا بھی امتحان لے چکے تھے۔ تمام باتیں زیر نقیشت رہیں البتہ شاہ بابر کے بارے میں یہ جان کر بھی کہ وہ محض حسب سابق آوارگی کے لیے دوستوں یا روں کے ہمراہ کیا ہوا ہے انہیں اس امر پر قطعی کوئی اعتراض نہ تھا۔

شاہوں کی زیارت پر انصاف کے دونوں پلڑے اسی وقت ڈنگا جاتے جب شاہ لالہ صرف اپنے صے کا امن موجود پاتے۔ صرف اپنی زندگی طلب کرتے اور صرف اپنی ذات کے لیے ہر فوجی چنتے۔

اس ترازو کا تول صرف ان کے ہاتھ میں تھا۔ جس طرف چاہے پلڑا بھکا دیتے لیکن تقدیر کے ترازو کا پلڑا بتول بی بی کے حق کے لیے جھک گیا۔

رات۔۔۔ دھڑکنے والے کے ساتھ آگئی۔ اور گہری خاموشی کے سنگ سنگ پھیلے ہوئے سنانے میں بتول بی بی کے قدم راہداری سے ہوتے ہوئے شاہ بانو تک پہنچ گئے شوخی قسمت کہ شاہ لالہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

واقعی نصیب کبھی کبھار بڑی فراخ دلی سے یاوری کرتے

ہیں۔

نور محمد جہاں کے لائے ہوئے حساب کتاب کو دوبارہ چیک کرتے ہوئے شاہ لالہ کو روشنی میں اک سائے کے لہرائے کا احساس ہوا اور وہ چونک گئے۔ دروازے میں بتول کھڑی تھیں۔

سید، بتول فاطمہ ان کے در سے دھکاری ہوئی ان کی اپنی خاندانی رفیقہ حیات جسے بانو کی جوتی بنانے کے بعد بھی انہیں یہ خیال کبھی نہ آیا کہ بے شک بانو کی جوتی ایک حقیر شے ہی سہی بہر حال اس کے بغیر اس دھرتی پر قدم رکھنا یا چلنا ممکن ہی نہیں۔

احساس تقاضے نے شاہ لالہ کے احساس پر تری کو مزید بلند کر دیا لیکن ایک ذرا جلد بہ رحم بھی ابھر آیا۔

کسی قدر محتاج بنے بس اور قابل رحم مخلوق تھی۔ ہر بار ٹھکرائے جانے پر بھی وہ بناوکی طلب میں بار بار ان کے در پر آن گرتی تھی۔ شاہ لالہ مسکرائے۔ اس مسکراہٹ میں وہ طنز واضح تھا جو کسی بھی پر غور شخص کے لبوں پر محض اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب وہ انتہائی رعونت سے کسی بھکاری کے کشکول میں چند سکے ڈال رہا ہو۔

برسوں بعد۔۔۔ آج بی بی ان کی زندگی کے وقت سے چند لمبے چرانے آئی تھی۔

"کیا بات ہے؟" شاہ لالہ کی آواز نے بتول کو چونکا دیا۔

اس وقت کی دلچسپ کھڑی وہ مظلوم اور بے بس تنہا عورت۔ نہ جانے کس آس کی طلب میں تھی۔

"میں۔۔۔ میں آپ سے کچھ کنا چاہتی ہوں۔" ٹھنڈی ہوا کے مجموعوں کے ساتھ بتول کی آواز شاہ بانو کی جھکت تک پھیل گئی اور بتول بی بی کے صفی کا دل مسکرایا۔

اس دل کے اونچے سنگھاس پر بیٹھا ہوا ایک سنگ دل بت خاموش تھا جس میں باقی تمام دنیا کے لیے تو بہت کچھ تھا مگر سیدہ بتول فاطمہ کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

"اندر آجیے۔" برسوں کے بعد یہ پھر کابت پکھلا اور دل کی دلچسپ کے اندر اترنے کی اجازت مل گئی۔

بتول کے قدموں نے کمرے کی دلچسپ پار کی اور دھڑکنے لگا۔

دل دھک دھک کی آواز کے ساتھ بولنے لگا۔ "صفی۔۔۔ صفی۔۔۔ صفی۔"

"شاہ بی بی!" اس نے اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیر کر بات شروع کی۔ "آپ ہم سے غافل ہی سہی لیکن اس دور سے آپ کی طویل غیر حاضری کئی مسائل کو جنم دیتی ہے۔"

191

آپ کی غیر موجودگی میں ہر فرد اپنی مرضی سے جیسے لگتا ہے اور۔۔۔

”اور کیا۔۔۔؟“ ان کی بھاری آواز شاہ باؤس کی ہمت سے ٹکرائی۔

”اور کئی قسم کے حالات خراب ہو جاتے ہیں۔“

بتول کچھ کہنے کی کوشش میں لفظ تلاش کرنے لگیں اور ان کا انجانے میں کہا گیا یہ فقرہ شاہ لالہ کی اس فطرت میں

بجس پیدا کر گیا جس فطرت کے تحت وہ دوسروں کی کمزوریاں اچھال کر ان پر حکومت کرتے تھے۔ بتول نے دیکھا۔ ان کی بات مکمل طور پر سننے کے لیے وہ ذرا آگے کی

جانب جھک آئے تھے۔ ان کی بھوری آنکھوں میں بے پناہ سوالات تھے اور ایک مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ سنہری مونچھیں مسکرا رہی تھیں۔

یہ وقت۔ بہت بھلا تھا۔

ان کی برسوں سے پیاسی زبان ایسے ہی کسی وقت کی حاشی تھی۔

اور آج بلاشبہ قدرت مہمان تھی بہت مہمان۔

”کیسے دبیے نہیں۔“ وہ بولے۔ ”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

وقت کا لفظ ایک بل مہمان ہوا اور آگے کی سمت جھکے ہوئے صفی نے بتول کے دونوں ہاتھ تمام لیے۔

اچھی رات مظلوم رعایا کی شکایات میں گزرنے لگی۔ اس رات کی سوغات لیے ہوئے روشن سویرا طلوع

ہوا۔ بتول بی بی شاہ باؤس سے نیچے حویلی کی جانب آئے لگیں اور انہیں دیکھ کر ایک معنی خیز مسکراہٹ شاہ ہالی

کے چہرے پر پھیل گئی۔ شاہ بی نے باکمال مہربانی بے حد عنایات فرمائی تھیں اور بدلے میں اپنی مظلوم رعایا کے وہ

درپردہ حالات معلوم کر لیے تھے جن کی رو سے ان پر کسی بھی قسم کا فرد جرم عائد کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

اس وقت کے روشن سویرے سے اپنی ذات کے لیے چند لمحے چرانے کے بعد بتول بی بی اوچی حویلی کے اندر

چوروں کی طرح دبکی۔

مکمل تیاری کے بعد صفدر حسین شاہ باؤس کو ساتھ لیے ہوئے گل لالہ کی۔ بیٹھک کے سامنے والے صحن میں آکر رک گئے گل لالہ اپنے مہمان کے ساتھ اندر موجود

تھے۔ نور محمد جہاں نے انہیں دیکھا اور باہر نکل آئے۔

”جہاں صاحب! دیکھتے ہی شاہ لالہ نے اوچی حویلی میں

کہا۔

”یہ کیا تھا شاہ باؤس یہاں؟“

نور محمد جہاں کچھ نہ کہہ سکا خاموش رہا۔

”آپ جواب کیوں نہیں دے رہے۔“ وہ بلند غصیلے

لمبے میں گویا ہوئے۔ ”میں پوچھتا ہوں پیر محمد الدین جی درگاہ مغوروں کا مسکن کب سے ہو گئی؟“

نور محمد جہاں مناسب جواب دینے کی کوشش میں خاموش کھڑا رہ گیا اور گل لالہ بیٹھک کے دروازے میں

صفدر حسین شاہ کے بالکل سامنے آگئے۔ مدت کے بعد دونوں آمنے سامنے آئے تھے لیکن خلیج اتنی گہری تھی کہ اسے عبور کرنا مشکل تھا۔

ایک طرف محب وطن عہد کا پاسدار گل زمان شاہ دوسری طرف اپنی ذات کے گرد نام نہاد ان کی فصیلیں

کھڑی کرنے والا صفدر حسین شاہ جو صرف اپنے اصولوں پر سودے بازی کرنے کا ہر تھا۔

وقت کا۔ احساسِ کلمہ موت اور رواداری کا۔

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر گل لالہ کی آواز آئی۔ وہ

کہہ رہے تھے۔

”تم بھول رہے ہو صفدر حسین! اگر تمہاری حکومت

وقت پر آئے ملک کے معاملات میں بلاوجہ الجھ کر ایک

بے معنی جہاد لڑتے ہوئے تمہیں لاکھ مجاہدین کو پناہ دینے کی

کوشش میں پورے اوچری کیسپ کی تباہی کی صورت میں

اپنی قوم کو بلاکتوں میں ڈال سکتی ہے تو پھر پیر محمد الدین کی

درگاہ ایک مسافر مسکین رشتے دار کی پناہ گاہ کیوں ثابت

نہیں ہو سکتی۔“

گل لالہ کے تمام الفاظ گرم سیسے کی مانند صفدر حسین

شاہ لالہ ایک مسکین پر گرج برس کر اپنی عدالت میں صفائی

کا کوئی بھی موقع دے بغیر اپنا فیصلہ سن کر چلے گئے۔ شاہ باؤس

سے سید شاہ بانو کی شادی کا فیصلہ۔

”آپ کوئی بدحالی و زحمتی نہیں ہوگی۔ سمجھیں تم۔“

وہ اپنے مرتبے اور شان سے کہیں کم تر درجے پر آکر بول

رہے تھے۔

”کتاہوں کی آڑ میں یہ کھیل کھیل رہی ہو تم اور تمہارا وہ

گل لالہ! اسے تو میں دیکھ لوں گا۔“ وہ دھمکی دے کر چلے

گئے۔

سہ پہر تک۔ شاہ بانو کے ذہن کی فضا میں غم اور

غمیے کی شدید کیفیت کے تحت لرزتی رہیں۔ شاہ بانو کے

آنسو مسلسل بہہ رہے تھے اور تمام غصیب شاہ ہالی ہاتھ

جوڑ کر التجا کر رہی تھیں کہ ”خدا را اس طرح آزار دہ نہ

ہوں۔“ مولانا کریم حضور کوئی راستہ نکالے گا۔ نصیبوں نے

یاوری کی تو شاید مرشد حسین سیدی نصیب بن جائے۔“

لیکن یہ طفل تسلیاں کسی کام نہ آئیں۔ شاہ بانو جانتی

تھی کہ یہ ایک خواب ہے۔ محض خواب۔ تعبیر تو وہی ہوگی

جو شاہ لالہ چاہیں گے اور اس تعبیر کا رخ کس قدر بھیانک

ہو گا۔ یہ خیال ہی روح فرما تھا اور حقیقت تو اس سے بھی

کہیں زیادہ تھی۔

عصر کے سامنے ذرا طویل ہوئے تو انگریزیاں لیتے اور

آنکھیں ملنے ہوئے سیدہ بتول فاطمہ کی بیداری عمل میں

آئی۔ جتنی ہوئی شب جذبوں کی سوغات عطا کر کے ماضی کی

ایک دلکش داستان بن چکی تھی۔

اوچی حویلی کی ہمت تلے شاہ بانو کی سسکیوں کی آواز

سن کر وہ بہت جلد واپس حقیقت کی دنیا میں آگئیں۔ شاہ

ہالی نے ان کے ہاتھ باندھ کر شاہ لالہ کا فیصلہ سنایا۔

ایک زہر آلود مسکراہٹ بتول کے لبوں پر پھیل گئی۔

وہ فاتحانہ قدموں سے چلتی ہوئی شاہ بانو کے کمرے کا

دروازہ کھول کر اندر آئیں۔ شاہ بانو نے اس آہٹ پر سر

انھا کر دیکھا جہاں جذبوں کا ایک جہان بیت لینے کے بعد

سیدہ بتول فاطمہ قانع قرار دیے جانے کے بعد اپنی ہی ذات

کے اس دکھنی اسٹینڈ پر کھڑی تھیں جو شاہ لالہ کی نظر گرم کا

محتاج تھا اور کسی بھی بے رخی کے لفظ ایک بل میں قدموں

کا ساتھ چھوڑ سکتا تھا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ شاہ بانو کا دل چلایا۔

خاموش کھڑی بتول کی آنکھوں کا جواب تھا۔

193

”عورت اپنے جذبات کی پامالی کبھی برداشت نہیں

کر سکتی۔ زندگی میں کبھی کسی بھی منزل پر صفدر حسین شاہ

کو جیت لینا میرا خواب تھا اور مجھے مدت کے بعد اس کی

تعبیر مل گئی۔“

”کیوں کس قیمت پر؟“ شاہ بانو کی نگاہوں کا سوال تھا۔

”میری زندگی کو داؤ پر لگا کر۔ کیوں۔ آخر کیوں۔؟“

بتول کے پاس اس ”کیوں“ کا کوئی جواب نہ تھا۔

شاہ بانو کی آنکھیں روٹی رہیں۔

سیدہ بتول فاطمہ خاموشی کے ساتھ پلٹ کر باجلی

تھیں۔

سہ شام۔ دل کے جہان پر چھائے ہوئے وحشت کے

ایک احساس کو کم کرنے کے لیے باپ پر اپنے لیے پناہ کی

تلاش میں شاہ بانو زیارت کی طرف چلی گئی۔

پہر خانے کی عقی دیوار سے نور محمد جہاں نے اسے

دیکھا اور ایک دم کسی بات کے یاد آ جانے کی بنا پر تیزی سے

چلتا ہوا اس کے سامنے آن کر۔ شاہ بانو کی نظریں انہیں

اور اس نے کہا۔

”جہاں صاحب! آپ۔؟ خیریت تو ہے نا؟“

”نہیں بی بی!“ انہوں نے جواب دیا۔ ”گل لالہ بہت

پریشان ہیں۔“

”کیوں؟“ وہ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے صرف اتنی ہی

پوچھ سکی۔

”نہیں جی۔“ اس نے رک رک کر بات شروع کی اور

شاہ بانو کا دل تیزی سے دھڑکتا رہا۔

”ہمارے مہمان مرشد حسین سید کہیں چلے گئے ہیں۔

ظہر کی نماز کے بعد گل لالہ کی آنکھ لگ گئی۔ بس بغیر اجازت

لیے وہ رخصت ہو گئے۔ شاہ لالہ نے بڑی زیادتی کی تھی اور

اس دن چھوٹے شاہ بی نے بھی بہت بد تیزی کی تھی۔ ہر

انسان کی ایک عزت نفس ہوتی ہے بس وہ برداشت نہ

کر سکے۔ چلے گئے خدا جانے کہاں؟ کدھر؟ کچھ خبر نہیں۔“

”ہر انسان کی فقط عزت نفس ہی نہیں ہوتی جہاں

صاحب! ایک دل بھی ہوتا ہے جس میں بے شمار آرزوئیں

ہوتی ہیں۔ بے پناہ چاہت ہوتی ہے۔ کئی دکھ ہوتے ہیں۔

اور وقت کے دبیے ہوئے کئی غم بھی۔ دل تو آرزوؤں کا

خوابوں کا گھر ہوتا ہے۔ پیار کا اک مرکز ہوتا ہے اور جب

دل ہی ٹوٹ جائے تو پھر عزت نفس کے بحرِ غم ہونے کا

احساس بھی دگنا ہو جاتا ہے پھر زندگی۔ زندگی نہیں

194

192

بقا محمد اور نور محمد جہاں پر تمام تر فخر نکالنے کے بعد وہ

اوپر اوچی حویلی کی طرف بڑھے۔ شاہ ہالی نے انہیں آتے

ہوئے دیکھا اور بھاگ کر شاہ بانو کو خبر کرنے چلی گئی۔ وہ

خوف اور ڈر سے کانپتی ہوئی برآمدے میں آئی۔

فرد جرم عائد ہو چکی تھی۔ برسوں بعد سیدہ بتول فاطمہ

دن کے ابالے میں بڑی گہری اور میٹھی خیند سوتی رہیں اور

193

192

193

192

193

192

193

192

193

192

193

192

193

رہتی۔ جہاں صاحب ایک روگ بن جاتی ہے۔ ایک آرزو بھرا روگ۔

نور محمد جہاں کہہ رہا تھا۔

"وہ ایک محب وطن انسان ہے جس میں نے اس کے بڑے میں حضرت قائد اعظم کی تصویر لگی ہوئی دیکھی ہے جی اہم خدا پاک کی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بالکل سچ۔"

شاہ بانو خاموش کھڑی مزار کی سمت دیکھتی رہی۔

نور محمد جہاں کہہ رہا تھا۔

"یہ لاری اس کی آخری تحریر۔" جہاں نے ایک سفید کاغذ شاہ بانو کی طرف بڑھایا۔ "یہ مجھے گل لالہ کی بینک کے میز پر ملا ہے۔ دیکھیے کتنی پرکھی تحریر ہے۔"

شاہ بانو کی نظریں اس تحریر پر جم گئیں۔ یہ تحریر خود اپنی زبانی اپنا دکھ بیان کر رہی تھی۔

"ہم کہ عبد شکستہ کے مظلوم اور دلخراش ماضی کی داستان لپے ہوئے معصوم لوگ۔ ہمیں معاف کر دیجیے کہ آپ کے اس خطے میں کل کی طرح آج بھی ہمارا نہیں۔ ہم تو پناہ گزین ہیں فقط پناہ گزین اور پناہ گزین کا کبھی کوئی وطن نہیں ہوتا۔"

ہم جی دست اور جی دامن اپنے طور پر یونہی جینے کی سعی کرتے رہیں گے۔"

وقت کے آسمان پر پھیلی ہوئی آدمی چاند کی چاندنی پر دم ہو گئی۔ وہ جہاں کے ساتھ گل لالہ کی بینک میں چلی آئی۔ وہ تھکا اور افسردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی شاہ بانو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی۔ اس دنیا کے بھرے میلے میں صرف وہ تو یہی خواہتے تھے۔ سچے اور مخلص بھائی گل لالہ۔

وہ ان کے کندھے سے لگ کر آنسو برساتے ہوئے دیکھی بے جھجک بولی۔

"وہ چلے گئے گل لالہ اچلے گئے۔"

اور وقت کے لگائے ہوئے اس چر کے پر دیکھی گل لالہ پر حیرت کا ایک پراثر ٹوٹ پڑا۔ شاہ بانو کی اونچی چوٹی سے نیچے پھیلی ہوئی داوی تک۔ ہر ایک چیز ریزہ ریزہ ہو گئی۔ انہوں نے دیکھا۔ بالکل سامنے لشکر میں آگ روشن تھی اور گلابی شعلے اوپر آسمان کی طرف بڑھنے کی کوشش میں بھج کر انکارے بنے جا رہے تھے۔

شاہ بانو؟ ان کی چھوٹی لاڈلی بسن بے خبری میں کسی انجانے سے اجنبی راہوں کی مسافر ہو چکی تھی۔

اور انہیں خبر ہی نہ ہو سکی۔

"تو گویا یہاں ہر فرد اپنی اپنی ذات کے دائرے میں مقید تھا۔ کسی کو بھی دوسروں کے جذبات و احساسات سے آنکھی نہ تھی۔ بھلا کیسے لوگ ہیں ہم۔"

"تم فکر نہ کرو۔" سن کا احساس دل بھر آیا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"گل لالہ! کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ جب تک شاہ لالہ نہ چاہیں۔"

"ہاں!" وہ سرد آہ بھر کر بولے۔ "وہ بھلا کب چاہے گا کہ ہم سب امن و سکون سے جییں۔ ان کی عدالت کا ہر فیصلہ ان کی اپنی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔ ہم اپنا انصاف اپنے رب پر چھوڑیں گے۔"

گہری شام بینک کے باہر اتر آئی تھی۔

اور گاندھی مگر جہاں کار بننے والا تھا انہوں نے اس دربار کا پرانہ دست کار نور محمد جہاں کہہ رہا تھا۔

"مرشد حسین سید پرایا نہیں تھا صاحب! ہمارا اپنا تھا" بالکل اپنا مگر افسوس۔ کہ ہم اسے پہچان نہ سکے۔ خدا جانے ہم لوگوں نے اپنی پہچان کے راستوں پر اتنے پھرے کیوں لگا دیے ہیں کہ بعض اوقات تو ہمیں خود اپنا آپ تلاش کرنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو قدر کا دلی تھا صاحب! ہم لوگ اسے پہچان نہ سکے! اسی درگاہ کے در کا مسافر۔ مرشد حسین سید! آپ لوگ تو ابھی بچے ہیں۔ گزرے ہوئے وقت کو نہیں جانتے کہ مگر اب کی بار تو بڑا ظلم ہوا۔ باپ کے بعد ہم بیٹے کو بھی پناہ نہ دے سکے۔ یہ بڑا ظلم ہے۔ ہم لوگ یقیناً بد نصیب ہیں۔ بہت بد نصیب۔"

اسی وقت چلی گئی کی طرف سے گاڑیوں کا شور سنائی دینے لگا۔ شاہ بانو اپنے منجیلے دوستوں کے ساتھ اپنی آوارگی کا جشن منا کر لوٹ رہا تھا۔ درگاہ شریف کے تقدس سے بے نیاز اپنی گاڑیوں میں تیز بے ہنگم موسیقی کا اور دم چلاتے ہوئے وہ سب شاہ بانو کے ڈرے پر آنے لگے۔

شاہ لالہ تک اس کی آمد کی خبر قحطی نے پہنچائی۔ وہ اس وقت برسوں سے فراموش کردہ بتول کے ساتھ گفتگو فرماتے ہوئے چند اہم رازوں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ وقت نے شطرنج کی اس پیچھی ہوئی بساط پر ایک اہم مہم سیدہ بتول کی صورت میں ان کے ہاتھ میں کر دیا تھا۔

"بہت بد معاش ہو گیا ہے۔" ان کا اشارہ شاہ بانو کی طرف تھا۔ شاہ بانو کی اس خصلت کو اس کے کردار کی ایک خوبی ثابت کرنے کی کوشش میں وہ بھول رہے تھے کہ یہ سب تو ان ہی کے بے جالاؤ پیار کا شاخسانہ ہے۔

وہ جنہوں نے بتول کو منہ نہ لگایا، آج وہ اس کے لاڈلے بھائی کی وکالت کرتے ہوئے اس کے حمایتی بن کر انصاف کی اونچی مسند پر تشریف فرما تھے۔

پیسے نہ مانے کا بہت عجب رنگ تھا۔

قحطی دروازے میں کھڑا انتظار ہوا کہ وہ کہہ رہے تھے۔

"بس۔۔۔ اب زیادہ دیر نہیں ہونا چاہیے۔ میں آج ہی جہاں سے کہہ کر تمام انتظامات مکمل کروا رہا ہوں۔ اگلے چاند کی چودہ تاریخ مناسب رہے گی۔ عرس کا موقع بھی ہے۔ بہت اچھا ہے کہ مدعوین کو دعوت نامے جاری نہیں کرنے پڑیں گے۔ بذاتِ خود تمام لوگ شریک ہو جائیں گے۔"

چنانچہ فیصلے کی توثیق ہو گئی۔

"مگر شاہ لالہ! شفیق اچانک بول اٹھا۔ "شاہ بانو کی امتحانات قریب ہیں اور وہ آج کل۔۔۔"

لیکن صندر حسین کی طرف سے بخشش میں عنایت کروہ چند لمحوں کی بھیک پا کر اتراتی ہوئی بتول نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آج کل وہ کس قسم کے امتحانات میں مگن ہے تم یہ بات نہیں جانتے۔ تم ابھی بہت چھوٹے ہو محمد شفیق!"

"بیوں کی باتوں میں نہیں بولا کرتے۔" شاہ لالہ نے تنبیہ کی۔ "جاؤ! اپنا کام کرو۔" انہوں نے درشت لہجے میں حکم دیا۔

آزاد دل شفیق حوتلی کے اندر چلا آیا۔ شاہ بانو کے کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی شاہ بانو دھوئیں کے بادلوں میں گھری ہوئی۔ لمبی چھوٹکی سے چوڑے میں چھوٹکیں مار کر بچھتے ہوئے انگاروں کو جلانے کی کوشش میں ان کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا لیکن سلی لکڑیوں کی جڑیں آگ کے شعلے پکڑنے سے انکاری تھیں۔

شفیق برآمدے میں موجود تھا کہ بقا محمد ڈیوڑھی میں آن رکا۔

"شاہ بانو! وہ منسوب لہجے میں بولا۔ "بستر ہے کہ نور میں بالن ڈال دو! میں تمہاری مدد کروں گا۔ چھوٹے شادی کے دوستوں کے لیے روٹیاں لگائی ہیں۔ لاٹری آج بیاہ

ہے اور نہ تمہیں زحمت نہ دیتا۔"

دھوئیں کے جھلکے بادل کے پیچھے سے شاہ بانو نے اس قدر لمبی تمسید سنی اور ان کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

"معاف کرو بابا! انہوں نے وہ نون ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مجھ پر اس مصیبت کی قیامت کیا کم ہے جو میں ان ڈھکروں کے لیے روٹیاں بنانے کا کام کروں۔ ہونٹ۔ کام کے نہ کان کے دشمن اتانج کے۔"

بقا محمد چند لمحے خاموش کھڑا دیکھتا رہا پھر اپنی صلح کن فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہاں چلا گیا۔

شفیق نے شاہ بانو کے کمرے میں جھانکا۔ نیچے کھائی کی طرف جانے والے راستے پر نظریں جمائے ہوئے خدا جانے وہ کس سوچ میں کم تھی۔

"شاہ بانو! شفیق نے آواز دی۔ وہ لالہ سرخ آنکھوں کے ساتھ چلی اور پھر اس کی رقت آمیز آواز آئی۔

"وہ چلے گئے۔ محمد شفیق! اپنا کچھ کہے۔ بنا کچھ تھائے۔ آخر کیوں؟"

محمد شفیق حیرت زدہ کھڑا رہ گیا۔

"شاہ بانو! وہ حیرت سے بولا۔ "آپ۔۔۔؟"

"میں اظہارِ تنہا نہیں کر سکی۔ شاید مجھے اسی کی سزا ملی۔"

اعتراف کا یہ لمحہ۔ ایک یقین بن کر پھیل گیا۔

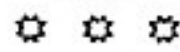
شفیق بات سمجھ چکا تھا کہ وہی اس وقت کا بہترین رفیق تھا۔ "شاہ بانو!" کے اونچے چوہارے سے قہقروں کی برستی ہو چھاڑنے واضح کر دیا کہ شاہ بانو اپنے تمام دوستوں سمیت شاہ لالہ کے دربار میں حاضری لگوانے کے لیے جا چکا ہے۔

نارنجی روپہ لہراتے ہوئے گنگنائی ہوئی بتول ڈیوڑھی سے اندر آگئیں۔ کل سے ان کے رنگ ڈھنگ نرالے ہو چکے تھے۔ ان کے مسکراتے ہوئے لب اپنی عارضی فتح پر سرشار گنگنا رہے تھے۔ محمد شفیق اور شاہ بانو نے دیکھا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک لوگ نگر گنگنا رہی تھیں۔

اؤ چہیے! لہ جلا درپے نی دو ٹھہرے ڈھولے دی قدر کرے! شاہ بانو اس کی سرشاری پر مسکراتی رہیں۔ وقت نے بھی خوب رنگ بدلا تھا اور نہ اکثر اس شاموں میں بتول بی بی

کی روش بکارتی۔
کھینچنے نول نور بیٹھی آرا
جوگی کھٹ کے لے آیا سلائیال

اور آج اس بے پروا نے نظر کرم فرماتے ہوئے
آرزوؤں کا ایک جہان سیدہ بتول فاطمہ کو بخش دیا تھا۔ کس
قدر انصاف پسند اور نخی تھا یہ بادشاہ جس نے برسوں سے
چلتے انگاروں کو پھولوں میں بدل دیا تھا۔



سیاہ رات۔ سنہری روشنیوں کے ساتھ زمین پر اتر
آئی۔
ذرا دیر کے لیے اپنے دل کی وحشتوں سے گھبرا کر شاہ بانو
باہر کی سمت نکلی۔ "شاہ ہاؤس" کے اونچے چوہارے پر
اب خاموشی کا راج تھا۔ طعام اور کپ شپ کا سلسلہ غالباً
ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بس ذرا سی دیر کے لیے حویلی اور
"شاہ ہاؤس" کے درمیان میں بنے حوض کے قریب بیٹھنا
چاہا لیکن اس کی نظرس اوپر کی سمت اٹھ گئیں۔ شاہ باہر نے
اپنی روایتی دکھاوے والی آن بان کے ساتھ اپنے عزیز ترین
دوست اسفندیار کے ہمراہ اپنے ڈیرے کی طرف جانے کے
لیے اسی سمت آ رہا تھا۔

حوض کے مرکزی کنارے کی طرف ایستادہ بادام کے
درختوں نے شاہ بانو کا وجود اپنے اندر چھپالیا۔
وہ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر گفتگو کرتے ہوئے اسی سمت
آگئے۔

"تو۔۔۔ یہاں قید ہے تیری وہ شہزادی جو اب رفیقہ حیات
بنے گی۔" اسفندیار نے حویلی کی دیوار کی طرف اشارہ
کیا۔

"ویسے یارا کیا شاہ لالہ نے تیری شادی کرنے کا فیصلہ
کرنے میں ذرا جلدی بازی نہیں کی؟"
"انہوں نے اچھا ہی کیا۔" شاہ باہر نے مطمئن انداز میں
کہا۔

"ابھی تو اس کی چاہت کا آغاز تھا اور اس کم بخت
جلاوطن کے بارے میں تو مجھے شک تھا کہ اپنے باپ کے
نقش قدم پر چلتے ہوئے کم بخت کہیں شاہ بانو کو بھگا کر نہ
لے جائے۔"

اسفندیار نے بے تحاشا بلند قہقہہ لگایا۔ "ہاں یارا تیرا یہ

شک بے معنی نہیں تھا۔ آخر تارنخ اپنے آپ کو دہرائی
مردور ہے نا!"

"مگر اب تارنخ بتائے گی کہ شاہ باہر کس چیز کا نام ہے۔"
وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"لیکن۔۔۔ اس شمع محفل کشمیر کا کیا ہے گا؟" اسفندیار
نے کہا۔

"وہ۔۔۔" شاہ باہر نے ہنس کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر
مارا۔

"اسے تو میں اپنے دل کی رانی بناؤں گا۔ تم نہیں جانتے
اسفندیار! محبوبہ اور بیوی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ شادی تو میں
کشمیر اسے بھی کروں گا۔ شاہ بانو کو تو میں اپنی باندی بنا کر
رکھوں گا۔ خود کو بڑا سمجھتی ہے۔ ویسے بھی یارا! ہمارے پاس
خاندانی بیوی صرف نسل کو وجود میں لانے کے کام آتی
ہے۔ وہ شوہر کا دل بسلانے کے لیے نہیں ہوتی۔"

شاہ بانو کا سارا وجود کانپ کر رہ گیا۔

شاہ بانو کے ڈیرے پر چھائی ہوئی سیاہ سرور رات کا نہتی
ہوئی گزرتی گئی۔

انجانے خوف کے احساس کے تحت شاہ بانو بادام کے بیڑ
کی اوٹ میں کھڑی لرزتی رہی۔

اسفندیار کو اس کا لہراتا ہوا آنچل نظر آ گیا۔

"وہاں۔۔۔ کون ہے؟" اس نے شاہ باہر سے سوال کیا۔
شاہ باہر کی نظرس اس سمت انھیں اور اک طنز مسکراہٹ
اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اسفندیار کی بات کا کوئی جواب
دیے بنا وہ تیزی سے چلتا ہوا شاہ بانو کے سامنے آ گیا۔ اس
کی خوف زدہ نظرس انھیں اور کانپتا ہوا وجود شاہ باہر کی
نگاہوں میں آ گیا۔

کشمیر پر چھائی ہوئی تاریک مہموری اور سرور رات۔ شاہ
ہاؤس کی مدھم روشنیوں کے عکس میں جھللاتا ہوا شاہ بانو
کا سر لپا اور اس پر چھائی ہوئی خوف کی کیفیت۔ شاہ باہر کے
اس احساس نقاخر کو بلند کرنے کے لیے کافی تھا کہ کچھ بھی
سسی بالآخر وہ بھی کسی عورت پر حکومت کرنے کا حق محفوظ
رکھتا ہے۔

احساس برتری کے اس لمحے کی ایسی سوچ نے ایک
تقبہ فضا میں بکھیر دیا۔

"آخاف۔ لیڈی ڈاکٹر صاحبہ!" وہ اونچی آواز میں
بولا۔ "بہت خوب۔ کیا امتحان کی تیاری ہو رہی ہے؟"

شاہ بانو اس طنز کا بھی ہمیشہ کی طرح کوئی جواب نہ دے

سکی۔ بس۔ بے بسی کی کیفیت میں کھڑی لرزتی رہی۔
 ”بہتر ہے کہ آپ حویلی کے اندر چلی جائیں۔“ اس نے بات دوبارہ شروع کی۔ ”اس سرد ہوا میں باہر کھلے آسمان تلے کھڑی ہو کر اسی طرح آپ اپنے عاشق کی یاد میں محضدی آئیں بھرتی رہیں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ بیمار نہ ہو جائیں۔“

شاہ باہر کے الفاظ انگارے بن کر شاہ بانو کے کانوں میں اتر گئے۔ اگرچہ وہ اس وقت خوف زدہ کیفیت کے پیش نظر لرز رہی تھی۔ تاہم اندر کی کسی آن دیکھی قوت کے تحت چند لفظ اس کی زبان پر آ گئے۔

”اگر تم میری ذات کے ساتھ نسبت اور تعلق کی برقراری کے باوجود تمہیں اسے عشق کر سکتے ہو تو کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں بھی اپنے دل کی بات مان لوں۔“ ایسی گہری بات سن کر شاہ باہر کے وجود میں ایک زلزلے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اپنی ہی ذات کے اندر تعمیر کردہ انا کی تفصیلس او اندھے منہ گر پڑیں اور اس کے کھوکھلے شہزاد کا سارا منظر سامنے آ گیا۔

شکستہ ویران اور اجازت منظر جس میں دور دور تک خود غرضی کے گرتے ہوئے بتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

”کیا...؟ ایک انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا؟“
 ”نکو اس بند کرو۔“ وہ چلایا۔ ”میں تمہیں“ آپ“ کہہ کر احترام سے مخاطب کر رہا ہوں اور تم مجھے ”تم“ کہہ کر میرے سامنے اپنے عشق کا اعتراف کر رہی ہو۔ کیا سمجھتی ہو شاہ بانو تم خود کو شاہوں کے اس دربار کی بیٹی شاہ باہر کی منگیتیرا پھر مرشد حسین سید کی محبوبہ ہو لو جو اب دو میری بات کا؟“ وہ چلایا۔

اسفندیار گھبرا کر دونوں کے قریب آ گیا۔ ”چھوڑو یا راتو نیچے ڈرے پر چلتے ہیں۔“

اس نے شاہ باہر کا بازو پکڑتے ہوئے اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا لیکن وہ غصے سے اپنا بازو چھڑا کر ہٹا چلا گیا۔

”جواب دو شاہ بانو!“ اس کی آواز بلند تھی۔

”شاہ باہر“ کے اوپری چوہارے کی طرف جاتی ہوئی بتول بی بی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر حالات کو سمجھنے کی کوشش میں ادھر چلی آئیں۔

”کیا بات ہے؟“ وہ سر اسید بولیں۔

”تباہ! آہ بہن کو سامنے پا کر اور شیر ہو گیا۔“ یہ۔۔۔

لہڑی ڈاکٹر شاہ بانو۔ مرشد حسین سید کی محبوبہ ہونے کا دعو کرتی ہے۔“ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے اس نے شاہ بانو پر الزام لگانے میں دیر نہ کی۔

”شاہ باہر۔“ شاہ بانو نے کہا۔ ”مجھ پر ایسا الزام نہ لگاؤ“ میں نے کسی کا۔ کوئی نام نہیں لیا۔“

”تو اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”تم دل سے تو اس کا اعتراف کر چکی ہو۔“

”تم نے میرا دل کب دیکھا ہے شاہ باہر!“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر تم دیکھ لیتے تو۔“

”تو پھر کیا ہو جاتا؟“ وہ بدستور چلا رہا تھا۔

”تو۔ اس میں بہتی ہوئی آرزو میں اور وفا میں دیکھ کر مارے شرمندگی کے میرے سامنے نظریں نہ اٹھا سکتے۔“

شاہ بانو کی اس بات کے جواب میں شاہ باہر کا ہاتھ اٹھا کر مردانگی کی زبان میں ایک بھرپور پھینکی اس کی ایسی جرأت کا جواب ہو سکتا تھا لیکن اسفندیار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

بتول بی بی بھی دونوں کے درمیان آ گئیں۔

شور سن کر شاہ بانو حویلی سے باہر آ گئیں۔ اسفندیار شاہ باہر کو ساتھ لیے ہوئے نیچے ڈرے کی طرف چلا گیا۔

شاہ بانو نے شاہ بانو کا بازو تھام کر کہا۔ ”اندر چلے بی بی! باہر بہت محض ہے۔“

”اس پر یہ محض کوئی اثر نہیں کر سکتی شاہ بانو!“ بھائی چلا گیا تو بہن نے طنز کے تیر چلائے۔ ”اس کے من میں تو آگ تلک رہی ہے۔“

”بالکل صحیح کہا آپ نے۔“ شاہ بانو کے اندر کی کسی قوت نے اسے جج بولنے پر مجبور کر دیا۔ ”یہ بھڑکی دی آگ ہے جس میں برسوں آپ جلتی رہیں اور اب یہ اس وقت نظام سفیدالی بادشاہی پا کر آپ سب کچھ بھول گئیں۔“

ایسا سچا سچ اور زہریلا جج سن کر سیدہ بتول فاطمہ خاموش ہو گئیں کچھ نہ بول سکیں۔

شاہ بانو نے شاہ بانو کو ساتھ لے کر حویلی کے اندر چلی گئیں۔

اور یہاں سے۔۔۔ اوپر شاہ باہر کے چوہارے تک کا سفر طے کرتے ہوئے بتول بی بی کے من کے اندر ٹھناتے ہوئے چراغ بجھ گئے۔ زمین پر پڑتے ہوئے قدم من من بھر بھاری ہو گئے اور شاہ بانو کے کسے ہوئے تلخ جج نے ان کے اندر آگ لگا دی۔

اور پھر۔۔۔ فوری طور پر فیصلہ کر لیا گیا۔

زندگی کے چند مہینوں لمحوں میں۔۔۔ وہ شاہ لالہ سے یہ منوانے میں کامیاب ہو گئیں کہ اگلے چاند کی پہلی تاریخوں میں شاہ باہر کی شادی کر دی جائے۔

اور اس سے پہلے کہ سورج سرکار اپنے حجاب کا پردہ سرکا کر وادی پر پھیل جاتا شاہ بانو گل لالہ کی بیٹھک کی دیلیر کھڑی بائٹل واپس جانے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔

خاموش اور بے بس نور محمد جہاں ساتھ کھڑا تھا اور اس کا مختصر سا سامان اپنے ہاتھوں میں لیے گل لالہ کے حکم کے منتظر تھا۔

”جہاں صاحب۔“ کچھ سوچ کر گل لالہ نے کہا۔

”نذر محمد سے کہیے جب لے آئے۔ آپ ساتھ چلے جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جائے اور بی بی کو ضرور پہنچا کر دے۔“

”جلدی چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔“ شاہ بانو کے واضح لمحے اور اپنی جرأت کا اندازہ کرتے ہوئے شاہ باہر کا دماغ گھوم گیا۔ بے اختیار دامن ہاتھ کا بازو بڑھا اور ہوائی فائرنگ کی آواز سے وادی گونج اٹھی۔ گل لالہ گھبرا کر اپنی بیٹھک سے باہر آ گئے اور شاہ بانو کے ساتھ بتول بی بی بھی سر اسید بنگھاؤں باہر آ گئیں۔

مارنگ واک کے لیے جاتے ہوئے شاہ لالہ گھبرا کر پل کے پار رک گئے۔ شاہ باہر جہاں سے بے معنی بحث میں الجھا ہوا تھا اور ہاتھ لہرا لہرا کر بدستور خوفناک تنک کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ گل لالہ بقاعہ کو ساتھ لیے ہوئے چلے آئے۔

”واہ گل لالہ۔“ نہیں دیکھتے ہی وہ چلا کر بولا۔

”بہن کو فرار کروانے کا کیا خوب منصوبہ بنایا ہے آپ نے۔ حالانکہ آپ بھول رہے ہیں کہ یہ میری منگیتیرا بھی ہے اور اس ٹاپے سے میری اجازت کی طلب کار بھی لیکن آپ کو تو اپنی حاکمیت خزانے کی بری عادت ہے۔“

گل لالہ نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے خاموشی میں عافیت جانی۔ شاہ باہر اجنبی چہروں کے ساتھ ان کی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ یہ تمام اجنبی چہرے اس کی دوستی کا دعو کرتے تھے۔ انہوں نے ایک نظریہ چادر میں لپیٹی شاہ بانو پر ڈالی اور پھر نذر محمد کو گاڑی واپس موڑنے کا اشارہ کیا۔

اونچی حویلی میں۔۔۔ پھر تک آنسوؤں کی برسات جاری رہی جبکہ ان احساسات اور جذبات سے بے خبر اپنے ماں جانے کی فتح کا جشن مناتے ہوئے سیدہ بتول فاطمہ تنگناکی رہیں۔ یہ لوگ گیت اپنے اندر دکھ درد اور موسیقیت لیے ہوئے شاہ بانو کے دل پر چر کے لگا رہے۔

میرے مولا دی ذات الہی اے بول کیسی رمز چلائی اے اڑ چڑی اے لہ جاو مسیے نی رو غمبہ ڈھولے دی قدر کہیے

عصر کے وقت شاہ لالہ نے اسے اپنے دربار میں طلب کیا تھا۔ شاہ بانو شاہ بانو کے ساتھ اوپری چوہارے کی طرف جانے کی بجائے گل لالہ کی بیٹھک میں آگئی تاکہ انہیں اپنے ساتھ جانے کے لیے کہہ سکے لیکن جہاں نے بتایا کہ وہ تو تھوڑی دیر پہلے ہی ”تشمیر کافرنس“ میں شرکت

کے لیے اسلام آباد روانہ ہو چکے تھے۔ مجبور اور بے بس شاہ بانو تنہا رہ گئی تھی۔

نور محمد حوالہ دے رہا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں بی بی! وہ لوٹ آئیں گے۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھے جتنی تسلی نہ دیں جو مال صاحب! شاہ بانو نے ہم آواز میں کہا۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ مخالف سمت میں چلنے والی ہوا فصلیں اجاڑ رہی ہے جو ظلم کاشت کرتے ہیں انہیں لو کا دریا عبور کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔"

وہ سماجی ہمالی کے ہمراہ "شاہ ہاؤس" کی طرف چلتے ہوئے اپنی ذات کی دکالت کے لیے سوچتی چلی گئی۔

"ہاں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ اب مجھے اپنی زندگی کا مقدمہ خود لڑنا ہو گا۔ کوئی کسی کے لیے اپنی زندگی کے اہم کام نہیں چھوڑتا۔ شاہ باور اپنی فطرت نہیں چھوڑ سکتا۔ سیدہ بتول فاطمہ روایتی حسد اور بغض نہیں چھوڑ سکتیں۔ شاہ لالہ حاکمیت جتانے کے بلند وبالا منصب کو نہیں چھوڑ سکتے اور گل لالہ اپنی مجبور اور بے بس بہن کے لیے اپنا ایک مقصد نہیں چھوڑ سکتے۔

اوب۔ وہ؟ دل میں گھر کر لینے والا مرشد حسین سیدا اپنی لاوارثی کی زندگی نہیں چھوڑ سکتا۔"

سوچیں زانیے بدل بدل کر لہرائی رہیں۔

اس کا ڈر تھا اور خود بلینز پر آن رکھا اور شاہ لالہ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی بتول بی بی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"شاہ بانو! شاہ لالہ کی آواز چھت سے ٹکرا کر بازوشت بناتے ہوئے اس کے کانوں میں اتر گئی۔ "شاہوں کی بیٹیوں کو یہ اجازت کس نے دی کہ وہ اپنے منگیتروں کی موجودگی میں فیروں کے لیے آہیں بھرس؟"

"شاہ لالہ! وہ اوب سے بولی۔ "اور شاہوں کے اس مقدس دربار کے صاحبزادوں کو یہ اجازت کس نے دی کہ وہ اپنا حسب و نسب بھلا کر آوارگی اختیار کریں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں اپنی پسند سے دوسری شادی کریں۔ اپنی جائز منگیتری موجودگی میں اپنا عشق "اپنا نہیں" جو بات آپ کے لیے جائز ہے وہ سب کے لیے جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ برافراہم اپنا یہ اصول سب پر لاگو رہے۔"

یہ بڑی گہری چوٹ تھی۔ شاہ لالہ تھکا اٹھے۔ بتول بی بی گھبرا کر کھڑی ہوئیں۔

سب سے ڈرنے والی، کبھی بھی نظر اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہ کر سکنے والی شاہ بانو آن بول رہی تھی۔

"آپ بھول رہے ہیں شاہ لالہ! اگر ہم فقط آپ کی رعایا ہی نہیں انسان بھی ہیں اور انسانوں کے دل بھی ہوا کرتے ہیں اور جذبات و احساسات بھی۔ مردوں کی دنیا میں جو اصول جائز ہیں وہ مظلوم عورتوں کی دنیا میں ناجائز کیوں قرار دیے جاتے ہیں۔ میں نے ایک خواہش کا اظہار کر دیا تو شاہوں کی درگاہ کا تقدس بھجھ ہو گیا لیکن سر شام اپنی ہی مستیوں میں مگن شاہ باور کے ڈر سے پرہیز محفل سے کسی کی ذات یا پھر زندگی کے تقدس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس درگاہ اور اس سے ملحقہ قبرستان میں سونے والے بزرگوں کی رو میں آرزو نہیں ہوتی۔

اور کیا شاہوں کے دربار کے تقدس کی اس پامالی پر مافی کی درگاہ کا کتبہ خون کے آنسو نہیں روتا؟

نہیں شاہ لالہ! یہ ظلم ہے ایسے یک طرفہ فیصلے کرنا کہنا ہے۔"

شاہ لالہ حیران رہ گئے۔ یہ زندگی نے شاہ بانو کو کیسا شعور بخشا تھا کہ روایات کی پاسداری کرنے والی شاہی الدین کی اولاد اپنے حقوق تسلیم کروانے کے لیے دلائل دے رہی تھی۔

ایسے دلائل جنہیں مانا جائے یا پھر رد کر دیا جائے۔

بہر حال وہ سچے تھے "جائز" مکمل اور سچے۔

"شاہ بانو۔" وہ حسب عادت اونچے لمبے میں بولے۔

"مردوں کی دنیا کے چند اصول ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں خواتین کی زندگی میں لاگو ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

حالات خواہ کچھ بھی سہی مگر جنہیں بزرگوں کی روایات کا احترام بہر حال کرنا ہے۔ تم صنف نازک سے تعلق رکھتی ہو جو اس دنیا میں قدرت کے اصول کے مطابق ایک کمزور مخلوق ہے اور یاد رکھو طاقت ور کے مقابلے میں کسی بھی کمزور مخلوق کو برابری کا دعو کرنے کی صورت میں پچھتانا پڑتا ہے۔"

"شاہ لالہ۔" بانو نے بتول بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر کبھی ہمارے نصیب زندگی کے کسی موڑ پر یاد دہانی کر جائیں تو پھر بھی پچھتاوے یا دلوں کے جھلٹاتے ہوئے

پرخا بن جاتے ہیں۔ بات تو ساری نصیبوں کی ہے شاہ لالہ! قطعاً اجازت نہیں تھی۔ وہ گل لالہ کے کندھے سے لگ کر رونا چاہتی تھی تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ انہوں نے تسلی تو دی لیکن ان کے الفاظ پر ہاتھ چڑھا گئے۔

"شاہ بی بی۔" وہ پیار سے بولے۔ "میں کوئی خون خرابہ نہیں چاہتا۔"

"مہمان جاؤ میری گزیا! ہم سب کی عزت اور بھلائی اسی میں ہے ورنہ شاہوں کے اس دربار پر خون کا دریا بہہ جائے گا۔"

"گل لالہ! وہ حیرت سے بولی۔ "آپ۔ آپ۔ آپ۔"

"میں مجبور تو نہیں۔" انہوں نے اعتراض کیا۔ "مگر مصلحت پسند ضروریوں اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ تم۔"

"بس گل لالہ! وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "وطن کے لیے سرحد کی بازی لگانے والا دل اتنا کمزور ہو گا کہ ایک مظلوم کا ساتھ نہ دے سکے۔ یہ تو بھی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ مہمانی، شکریہ کہ یہاں تک بھی آپ نے ساتھ دیا۔ ٹھیک ہے اگر تقدیر میں ایسا ہی لکھا ہے تو میں اس طرح بھی جی لوں گی۔"

وہ پلٹ کر اونچی حویلی کی طرف چلی گئی۔

بتول بی بی سرشار گھوڑوں کی آس لیے اوپر شاہ ہاؤس کی طرف جارہی تھیں۔ شاہ بانو پر نظر پڑتے ہی طنزیہ لہجہ اٹھ آیا۔

"تم بھول رہی ہو شاہ بانو! قیدیوں کو اس طرح آزاد پھرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"اور آپ بھی بھول رہی ہیں بتول بی بی! شاہ بانو نے جواباً کہا۔ "دوسروں کے جذبات کی پامالی کرنے والے کبھی خوش نہیں رہ سکتے، کبھی نہیں۔"

وہ حویلی کے اندر آئی۔ شاہ ہمالی چائے لے آئی تھیں اور منت کر رہی تھیں کہ وہ کچھ نہ سہی کم از کم چائے تو پی لے۔

"شاہ ہمالی۔" اس نے شکوہ کیا۔ "گل لالہ نے بھی میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں بھلا کس طرح جیوں گی؟"

"اس انکار کا بھی ایک سبب ہے۔" شفی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

شفی کی زبانی ان کی آمد کی خبر سن کر وہ تیزی سے بیٹھک کی سمت آئی۔ یہ جانے بنا کہ اسے حویلی سے باہر آنے کی

ہم آواز میں کہا۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ مخالف سمت میں چلنے والی ہوا فصلیں اجاڑ رہی ہے جو ظلم کاشت کرتے ہیں انہیں لو کا دریا عبور کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔"

وہ سماجی ہمالی کے ہمراہ "شاہ ہاؤس" کی طرف چلتے ہوئے اپنی ذات کی دکالت کے لیے سوچتی چلی گئی۔

"ہاں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ اب مجھے اپنی زندگی کا مقدمہ خود لڑنا ہو گا۔ کوئی کسی کے لیے اپنی زندگی کے اہم کام نہیں چھوڑتا۔ شاہ باور اپنی فطرت نہیں چھوڑ سکتا۔ سیدہ بتول فاطمہ روایتی حسد اور بغض نہیں چھوڑ سکتیں۔ شاہ لالہ حاکمیت جتانے کے بلند وبالا منصب کو نہیں چھوڑ سکتے اور گل لالہ اپنی مجبور اور بے بس بہن کے لیے اپنا ایک مقصد نہیں چھوڑ سکتے۔

اوب۔ وہ؟ دل میں گھر کر لینے والا مرشد حسین سیدا اپنی لاوارثی کی زندگی نہیں چھوڑ سکتا۔"

سوچیں زانیے بدل بدل کر لہرائی رہیں۔

اس کا ڈر تھا اور خود بلینز پر آن رکھا اور شاہ لالہ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی بتول بی بی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"شاہ بانو! شاہ لالہ کی آواز چھت سے ٹکرا کر بازوشت بناتے ہوئے اس کے کانوں میں اتر گئی۔ "شاہوں کی بیٹیوں کو یہ اجازت کس نے دی کہ وہ اپنے منگیتروں کی موجودگی میں فیروں کے لیے آہیں بھرس؟"

"شاہ لالہ! وہ اوب سے بولی۔ "اور شاہوں کے اس مقدس دربار کے صاحبزادوں کو یہ اجازت کس نے دی کہ وہ اپنا حسب و نسب بھلا کر آوارگی اختیار کریں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں اپنی پسند سے دوسری شادی کریں۔ اپنی جائز منگیتری موجودگی میں اپنا عشق "اپنا نہیں" جو بات آپ کے لیے جائز ہے وہ سب کے لیے جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ برافراہم اپنا یہ اصول سب پر لاگو رہے۔"

نہیں کی جاسکتی تھی۔ شام کے بلکے اندھیرے میں پیر خانے کے اندر جلتی ہوئی مدھم روشنی میں وہ سرایا نظروں کے سامنے آگیا۔ اکبر ابدن، سرخ و سفید چروہ سیاہ بالوں کے باؤل اور بادامی آنکھوں میں چھائے ہوئے قدرے خوف کے سائے، سیاہ چادر کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے سفید روٹی کے گالوں جیسے ہاتھ اور بست کچھ کہنے کی کوشش میں لرزتے ہوئے سرخ ہونٹ۔ آنے والی مسمان بلاشبہ قدرت کا حسین شاہکار تھی۔ شاہ بانو پیر خانے کی دلہنیزہ کھڑی ہو گئی۔

”کشمیرا۔“ اسے دیکھتے ہی شاہ ہمالی کے منہ سے بے اختیار یہ نام نکلا۔ ”ہائے۔۔۔ رہا۔۔۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟“

”کشمیرا۔“ شاہ بانو نے حیرت سے یہ نام دہرایا۔ شاہ بابا کی محبوبہ اور شاہوں کے دربار سے ٹھکرائی گئی برکت بی بی کی اولاد۔

برسوں پہلے۔۔۔ اس کی ماں راندہ درگاہ غصہرائی گئی۔ آج بیٹی کس چاہت کی طلب میں اس در پر آن گری تھی۔ کشمیرا کے عقب میں موجود برکت بی بی نے آگے بڑھ کر شاہ ہمالی کو گلے لگالیا۔

کشمیرا کوئی اجنبی یا غیر نہیں، بڑے شاہ جی کے خلیفہ خاص قربان شاہ کی اولاد تھی۔ برکت بی بی مضافاتی علاقے کی رہائشی تھی۔ اوائل عمری کے دن تھے۔ روایتی عقیدت مندی اور جذبے کے تحت اس کا درگاہ شریف پر آنا جانا تھا۔ قربان شاہ کی نظریں اس پر پڑیں اور پھر پلٹ نہ سکیں۔ قربان شاہ کچھ عرصے تک ہجرو وصال کے پھیروں میں زندگی سمیت چکر کھاتا رہا۔ بالآخر بڑے شاہ جی سے نکاح کے لیے اجازت طلب کرنے کا روادار ہوا لیکن وہ اس چاہت اور اس سے متعلق کسی بھی امر کے حق میں نہ تھے۔ چونکہ برکت بی بی کا باپ نیچے پھیلی ہوئی گھائی کے تازے پر شاہی کاڑہ دوست مخالف تھا۔ یہ زمین پر کھوں کے زمانے سے قتا زہ چلی آ رہی تھی اور اس لحاظ سے برکت بی بی کی والدہ کا کردار بھی کچھ مناسب نہ تھا۔ وہ وقت بے وقت ہر جگہ بڑے شاہ جی کی برائیاں کرتیں اور اس زمین پر ان کے قبضے کو عاصبانہ قرار دیتی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اکثر وہ ملی کمی کے بارے میں ایسے کلمات ادا کرتی جو کسی بھی صورت میں مناسب قرار نہیں دیے جاسکتے تھے۔

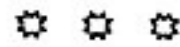
قربان شاہ نے بست کوشش کی کہ معاملہ سلجھ جائے وہ

احکامات کی حکم برداری کی صورت میں وہ شاہ بانو کا خون کر دیں گے۔ گل لالہ مجبور اور بے بس ہیں۔ وہ آپ کو زندہ و سلامت دیکھنا چاہتے ہیں، کسی بھی قیمت پر۔“ بھئی معصومیت سے بولتا چلا گیا اور حیران و پریشان شاہ بانو اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”یہ بالکل سچ کہہ رہا ہے۔“ شاہ ہمالی نے تائید کی شاہ لالہ کے جنون کا اندازہ کرتے ہوئے گل لالہ نے مصلحت کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ شاہ بانو نے سوچا۔ ”روایتی پاسداری پر قربان ہو جانا ہی اگر زندگی ہے تو پھر یوں ہی سہی۔ مگر ہو گا کیا؟ بڑے شاہ جی کا خواب کالج کی چوڑیوں کی مانند ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ برسوں کی محنت اکارت جائے گی۔ میری کتابیں، میرا مقصد حیات اور میرا مستقبل۔ سب ہی کچھ کھو جائے گا، تم ہو جائے گا اور میں شاہ بانو حیات کے انجانے راستوں پر اپنے لیے اپنی زندگی اپنی خوشیاں تلاشتی رہ جاؤں گی۔“

کھڑی سیاہ شام شاہوں کی حویلی کے اندر اتر آئی۔



وہ شاہ ہمالی کے پاس چولہے کے قریب بیٹھی جلتی ہوئی لکڑی کے ایک ٹکڑے سے راکھ کرید رہی تھی کہ اچانک نور محمد حموال اندر چلا آیا۔

”بی بی!“ اس نے شاہ بانو کو مخاطب کیا۔ ”آپ سے کوئی خاتون ملنے آئی ہیں۔“

”کون ہیں؟“ شاہ بانو نے پوچھا۔ ”کہاں سے آئی ہیں؟“

جہوال کچھ سوچنے لگا جواب نہ دے سکا۔

”آپ۔ انہیں یہاں لے آئیے۔“ شاہ ہمالی نے کہا۔

”وہ یہاں نہیں آسکتیں۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”آپ کو میرے ہمراہ پیر خانے تک چلنا ہو گا۔ وہ وہیں تشریف فرما ہیں۔“

شاہ بانو نے شاہ ہمالی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی چادر سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چلیے دیکھ لیتے ہیں کون ہے؟“

پیر خانے تک آتے ہوئے شاہ بانو کا دل دھڑکتا رہا۔

”شاہ ہاؤس“ میں شاہ لالہ علاقے کے معززین کی محفل سجائے بیٹھے تھے۔ اگر انہیں خبر ہو جاتی تو پھر خیر کی توقع

برکت بی بی کے ساتھ گھر بسانا چاہتا تھا لیکن شادی اس بات کے حق میں نہیں تھی۔ جب تمام کو ششیں ناکام ثابت ہوئیں تو قریان شاہ نے برکت بی بی سے نکاح کر لیا۔ بڑے شاہ جی انکھار ناراضی کے طور پر خاموش ہوئے۔ قریان شاہ کی اس گستاخی پر بلاشبہ وہ براہم تھے کہ وہ ان کے انزی و سمن کی جی کو درگاہ شریف کے اندر لے آیا تھا۔

قریان شاہ کا گھر بس گیا مگر بڑے شادی کا دل اجڑ گیا۔ وہ اسے اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے لیکن وہ اس گستاخی کا مرکب ہونے کے باوجود اپنی اجارہ داری پر قرار رکھنا چاہتا تھا۔ بڑے شاہ جی نے سزا کے طور پر اس سے اپنے خلیفہ خاص ہونے کا منصب واپس لے لیا تھا۔ قریان شاہ کو اس بات کا بہت رنج تھا کہ اب وہ بڑے شاہ جی کی نظروں میں معتبر نہیں گردانا جاتا تھا۔ علاقے کے عقیدت مندوں میں اس کی بڑی سکی ہوئی تھی۔

وہ پیر خانے سے ملحقہ احاطے میں اپنے دو کمروں کے مکان میں تنہا رہ گیا تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ زمانے نے اس کی قدر نہیں کی اور شاہ جی کی خدمت گزاری کا اسے کوئی خاص صلہ نہیں مل سکا۔ بہت جلدی اس کی طبیعت میں عجب قسم کا چرچہ اپن اتر آیا۔ وہ بات بے بات برکت بی بی پر برسنے لگا۔ کبھی کبھار درگاہ شریف کے اوپری احاطے میں جا کر مریدوں سے خواستہ جیج و پکار کرنے لگتا۔ ایک شب تیز برستی بارش میں اس نے کئی لکڑیاں سلگانے کی ناکام کوشش میں مصروف برکت بی بی کو بے تحاشا پیٹ ڈالا۔ خدا جانے وہ کس بات پر اس قدر مشتعل ہو گیا تھا۔ روتی چلائی ہوئی برکت بی بی بھاگ کر درگاہ شریف کے مرکزی دروازے میں جا کر جیج جیج کر دہائی دینے لگی۔ پھر بڑا ستم ہوا۔

اس کی جیج و پکار سن کر بڑے شاہ جی کا چلہ نوٹ گیا۔ وہ اپنے مخصوص دائرے سے باہر آگئے اور اس کے ساتھ ہی گرج چمک کے ساتھ ایک طوفان اٹھ آیا۔ کشمیر میں اس شب بادل گرج گرج کر رہے اور صبح دم لوگوں نے دیکھا۔ شاہ جی اور برکت بی بی کے والد کے مابین زیر تنازعہ زمین دریا برد ہو چکی تھی۔

اور اسی کہانی کے عقبی سمت قریان شاہ مردہ پایا گیا۔ غیظ و غضب کی ایک گھڑی میں بڑے شاہ جی نے برکت بی بی کو درگاہ شریف سے نکال دیا۔ اور یہ خیال عام تھا کہ قریان شاہ کو بلاشبہ ماسٹر عبد الرحیم

کی بددعا لگی تھی۔ برکت بی بی کے تین درگاہ شریف کے اندرونی احاطے میں فریاد کرتے رہے اور بالآخر وہ اپنے سیکے کی طرف لوٹ گئی۔ قریان شاہ کے خواب ہمیشہ کے لیے سو گئے۔

وقت بدلا اور بڑے شاہ جی کا پوتا شاہ بابر قریان شاہ کی بیٹی کشمیر کی زلف کا امیر ہو گیا۔

اور آج۔ برسوں بعد کشمیر اس درگاہ شریف کے باسیوں کو ایک صلاح دینے آئی تھی۔ اسن اور سلامتی کی صلاح۔ باہر سخن میں کھڑے نور محمد جوال کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ایک کے بعد دوسری اور پھر دوسری کے بعد تیسری داستان سامنے آ رہی تھی۔ برسوں بعد برکت بی بی کی آرزو درگاہ شریف کی سرزمین پر اپنا مین کر رہی تھی۔

درگاہ شریف کے باسیوں کا یہ خیال قطعی غلط ہے کہ اپنے ماضی کی کسی زیادتی کا بدلہ لینے کے لیے میں نے شاہ بابر کو اپنے درکار راستہ دکھایا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں نے اپنا نصیب جان کر قبول کر لیا۔ میں تو خاموشی کے ساتھ اپنی کشمیر کو لیے ہوئے اپنے باپ کے آبائی گھر میں ہی ہوتی تھی۔ تقدیر نے شاہ بابر کو میرے درکار راستہ دکھایا۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق ادھر ادھر مگھوٹنے کا عادی تھا۔ اکثر اوقات کشمیر گھر کی سڑک کے پار قاضی کے ہوٹل سے دوڑھ لینے جایا کرتی تھی۔ شاہ بابر نے اسے دیکھا اور اس نے میرے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ میں نے بہت چاہا کہ وہ پلٹ جائے مگر میں اس کی جتنی اور ضدی فطرت کے سامنے ہار گئی۔ اب بھی وہ گھنٹوں اپنے یاروں کے ہمراہ قاضی کے ہوٹل پر بیٹھا رہتا ہے اور موقع پاتے ہی بلا تکلف میرے گھر کا دروازہ کھول کر اندر آ جاتا ہے۔ وہ کشمیر اسے عشق کا دعو کرتا ہے اور میرے ماضی کی مجبوریوں کا مذاق اڑاتے ہوئے مجھے انتقام کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ میں نے بار بار شاہ بابر کے دربار میں عرضیاں ارسال کیں کہ وہ اس بارے میں میری مدد کریں لیکن ان کے رخ جواب کا ایک ایک لفظ میرے دل میں کہنیاں بن کر اتر گیا۔ شاہ لالہ نے جواب دیا تھا۔

”شاہوں کے بیٹے اکثر ان اہل سلاسل کے لیے باندیوں کی اولاد سے عشق کا کھیل کھیلتے ہیں اور پھر اونچی چوٹی کی پاکیزہ خواتین کو زندگی میں لینے کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔“

”میں نے صبر کر لیا اس درگاہ سے کل کی طرح آج بھی کوئی انصاف میرے نصیب میں نہیں تھا۔ شاہ بی بی آپ اس جتنی اور وحشت زدہ انسان کی ضد ہیں اور میری بیٹی اس کی محبت۔ ضد اور محبت ندی کے دو کنارے ہوتے ہیں۔ ساری زندگی ایک ساتھ چلتے ہیں مگر کبھی مل نہیں سکتے۔ ہم ماں بیٹی آپ سے الٹا کرنے آتی ہیں۔ آپ اپنی ضد چھوڑ دیجیے۔ شاہ بابر سے شادی کے لیے ہاں کہہ دیجیے شاید اس طرح وہ کشمیر کو بھول جائے۔“

برکت بی بی اپنے آنسو پونچھنے لگی اور شاہ بانو حیرت سے سوچتی رہ گئی۔ اس درگاہ شریف سے متعلق ہر فرد آخر میری ذات ہی سے قربانی کا طالب کیوں ہے؟ میں اپنے کسی کس جذبے کی قربانی دوں گی۔ اپنی ذات کی؟ اپنی زندگی کی؟ اپنے نفس کی یا پھر اپنے شاندار مستقبل کی قربانی؟

تو کیا لیڈی ڈاکٹر شاہ بانو ایک عام عورت کی طرح شوہر کی بے وفائی پر بے بسی سے آنسو بہانے کے لیے زندہ رہے گی؟

وہ ساری زندگی ایک بے وفامرد کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے آپ سے شکوے شکایات کرتے ہوئے گزار دے گی۔

اور کیا شاہوں کی یہ درگاہ ہمیشہ اسی طرح اپنے ماضی کو تائب کی طرح دہرائی رہے گی؟

”نہیں۔“ ایک دم شاہ بانو کے من سے نکلا۔ ”میں لیڈی ڈاکٹر شاہ بانو ایک کمزور عورت ہونے کے نالے اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی۔ مشکل ہے یہ۔ بہت مشکل بلکہ ناممکن۔ زندگی ایک باب فقط ایک بار بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ میں اسے اس طرح کھو نہیں سکتی۔“

سامنے بھیجی ہوئی کشمیر نے انھیں کر شاہ بانو کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

”مجھے شاہ بابر سے محبت کا اقتدار تو ہے لیکن میں اپنے دل پر قادر نہیں۔ میری مجبوری مجھے احساس دلاتی ہے کہ میرا ایسا کرنا قطعی مناسب نہیں لیکن شاہ بابر ایک ضدی اور جتنی شخص ہے۔ ہر وقت نفس کے سرکش گھوڑے پر سوار رہتا ہے۔ اب وہ وحشت اور جنون کی ایک ایسی دنیا کا باسی ہو چکا ہے۔ جہاں وہ اس دعوے کو جی ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہے کہ شاہ بانو کے انکار کی صورت میں وہ خون کا دریا بہا دے گا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کچھ بھی

کر گزرے گا۔ میں جانتی ہوں مجھ میں اور آپ کی ذات میں بہت فرق ہے۔ ایک واضح اور نمایاں فرق۔ کبھی نہ مٹنے والا۔ میری ماں شاہوں کی اس درگاہ کی حکمرانی ہوئی ایک باندی ہے اور آپ کی ماں اس اونچی چوٹی کی ہمو بھی پھر بھی۔ وہ مجھ سے پیار کا عودار ہے اور آپ سے شادی کا روادار۔ اس کی شخصیت کا یہ دوغلا پن ہماری اس تہذیب کی دین ہے جس کے تحت ہر فرد دوسری زندگی گزارنا ہے۔ مجھے اس سے محبت کا نہیں وفا کا عوا ہے۔

میں نے وفا کا سبق اپنی ماں سے سیکھا ہے۔ ہم اس در سے ٹھکرائے گئے تو بھلا کیا ہوا؟ ہم اس درگاہ سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔ آپ ہماری التجا قبول کر لیجیے مان جائیے۔ ہم نے یہ سرزمین چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یقین کیجیے۔ میں اس لمحے جب آپ شاہ بابر کو قبولت کا شرف بخشیں گی۔ ہم اس سرزمین سے کوسوں دور ہوں گے۔ کبھی پلٹ کر واپس نہ آنے کے لیے۔ مان جائیے۔ آپ کی بڑی مہمانی ہوگی۔ ہم اس درگاہ پر خون خرابہ دیکھنا نہیں چاہتے۔“

شاہ بانو نور محمد جوال شاہ بانو حیران رہ گئے۔ ایک راندہ درگاہ سے ایسی وفائی کی تو امید ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ آج ماں بیٹی اس درگاہ پر بیٹے چند لمحات کا قرض چکانے آئی تھیں۔ ساری انشا خاموشی اور ساکت ہو گئی۔

مجبور و بے بس گل لالہ بہت کچھ سوچتے ہوئے بیٹھک کے صحن میں فسلتے رہے۔ برکت بی بی اور کشمیر انجانی آس لیے ہوئے لوٹ گئیں۔ شاہ لالہ نے اپنی حاکیت کے زعم میں شادی کا دن مقرر کر دیا اور شاہ بابر نے اپنی زندگی کی اس خوشی میں دوستوں کے ساتھ ایک عظیم الشان جشن کی تیاری عمل کر لی۔

شاہوں کے ذریعے پر طلوع ہوئی ہوئی صبحیں اور ڈوبتی ہوئی شامیں درد کا ایک پیام لیے آئے لگیں۔ مرشد حسین سید سے جدائی کا دکھ اپنی بے بسی مجبوری اور اپنی اس خدائی کا دکھ جواب زندگی کے کرب میں اضافہ کرنے والی تھی۔

شاہ لالہ نے شیریں کو شادی کا بلاوا بھیجا۔ وہ بچوں سمیت آن پہنچیں۔ چمن ڈرش اور ذکا خوش تھے کہ اس سرزمین کی زندگی انہیں ہمیشہ سے ہی بہت پسند تھی۔

اور پھر بڑے ستم رسیدہ لمحات زندگی میں در آئے تھے۔ شاہ بانو کی آنکھیں تو روتی ہی تھیں۔ سیدہ بھول فاطمہ کی نظام سقد والی بادشاہی بھی ختم ہو چکی تھی۔ شاہ بانو اور

مرشد حسین سید کی بخیر کے عوض حاصل کردہ خوشی کے چند لمحات اس وقت روایتی رنگ میں بدل گئے۔ جب شیریں کی آمد کے ساتھ ہی شاہ لالہ نے اپنی آنکھیں مٹاتے پر رکھ لیں۔

اس شام کے سیاہ اندھیرے میں، بتول بی بی بلک بلک کر روئیں۔ کیا حاصل ہوا؟ بے معنی اور پٹا پٹا خوشی کے وہ چند لمحات جو اب ماضی کی ایک درد بھری یاد بن گئے تھے۔ ایک مرتبہ پھر شاہ لالہ نے بتول کو اپنی زندگی سے نکال دیا تھا اور اب کی بار۔ یہ چوتھی بڑی ناقابل برداشت تھی۔ سیدہ بتول فاطمہ نے شاہ لالہ کو اپنی ساری وقایع سوئپ دیں مگر بدلے میں کچھ نہ پاسکیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح تنہا تھیں حتیٰ دست تھیں اور حتیٰ دامن بھی۔ اب گیت نے رنگ بدل لیا تھا۔

اؤ چسپے بس جاوے نی
روغبت ڈھولے دی قدر گریے
سویاں چنیاں سوہے چولے نی
جن نر گئے ہوئے ہوئے
اور ان کی دھجی آواز سن کر شاہ بانو نے سوچا۔

آگ کی تپش کا اندازہ تو صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ اپنے دل کے اندر لگی ہو۔ کسی دوسرے کے من میں لگی آگ تو بھٹی کا سبب بن سکتی ہے لیکن جب اپنا تن سلک رہا ہو تو پھر بہت تکلیف ہوتی ہے۔ آپ بھول گئیں بتول بی بی اگر شاہ بانو بھی ایک عورت ہے۔ احساسات اور جذبات کا مرقع ایک عورت جس کے جلتے ہوئے دل کی کسی بددعا نے آپ کو چند لمحوں کی خوشی دے کر ہمیشہ کے لیے تنہا دامن کر دیا۔

صبح کا روشن تارا ڈوب چکا تھا۔ کل لالہ فجر کی نماز کے بعد حوٹلی کے اندر آگئے۔ شاہ بانو کی متورم آنکھوں نے اپنے دکھ کی ساری داستان کہہ سنائی۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”شاہ بانو“ وہ رقت آمیز لہجے میں بولے۔ ”میں نے تمہیں بڑے بھائی کی طرح ہی نہیں چاہا بلکہ ایک باپ کی حیثیت سے تمہاری پرورش کی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ بچپن کی طے شدہ اس نسبت نے مجھے مجبور کر دیا۔ تمہیں یہ قربانی ضرور دگی شاہ بانو اگر اسی میں ہم سب کی عاقبت ہے۔ بعد میں جو ہو گا اس کا رب مالک ہے۔ دیکھا جائے گا۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں، ہمیں وقت کی نزاکت کو سمجھنا

چاہیے۔“
اور کل لالہ شاہ بانو کے قدموں میں جھک گئے۔
شاہ بانو مجبور ہو گئی۔

خاموشی۔ جو اس تہذیب کے روایتی اصولوں کے مطابق نیم رضامندی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

کل لالہ کی بیٹھک سے باہر کھلے میدان میں شاہ بابری کی بارات سج سنور کر اتری اور اوپر شاہ ہاؤس کے چوہارے پر شاہ بانو کی سچ سجائی گئی۔ لکڑی کے چوہارے پر بنے وسیع برآمدے میں اونچا اٹھج بنایا گیا جہاں دلہن کے روپ میں شاہ بانو کا وجود سج گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر کھلے ہر طرف روئیاں تھیں۔ زندگی کے تمام رنگ اس سے بے حد خوبصورت لگ رہے تھے۔ البتہ بالکل پار سائے لکڑی میں جلتے آگ کے کلابی شعلے چلاتے ہوئے اس قدر نا انصافی پر فوج نکلاں تھے۔

اور بڑی شان سے اس پر احسان عظیم فرماتے ہوئے شاہ بابر نے اسے شرف قبولیت بخشا تھا۔

اپنی زندگی کے اس انتہائی اہم کردار کو بھانے کی کوشش میں اگرچہ وہ ہنس رہا تھا دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا۔ تاہم اس کی روح بے چین و مضطرب تھی۔ کشمیر! اپنی ماں کے ہمراہ ہر سون شام سے غائب تھی۔ ان کے در پر بڑا ہوا مالا شاہ بابر کو اپنی اس جیت کے بدلے ایک انوکھی بار کی اطلاع دے رہا تھا اور اس وقت شاہ بابر قطعی طور پر کوئی بھی بار قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اچانک اس کی قوت سماعت نے ایک اُن چابی بات سنی۔ وقت کی نزاکت سے بے خبر نادان قحطی ڈکا کو پیر خانے میں کشمیر کی آمد اور شاہ بانو سے ملاقات کی روئیداد سناتے ہوئے کشمیر کے اس سرزمین کو چھوڑ کر چلے جانے کے عزم و ارادے کو بیان کر رہا تھا۔ وہ بذات خود اس واقعہ کا معنی شاید ہونے کا دعویدار ساتھ ساتھ یہ بھی جتنا رہا تھا کہ وہاں کا ست عمر میں بڑا ہونے اور کل لالہ کا منظور نظر ہونے کے باعث بہت کچھ جانتا تھا۔

اور شفی کی یہ نادانی حالات کا رخ پلٹ گئی۔
لکڑی کے جلتے ہوئے شعلے شاہ بابر کے دل میں اتر گئے۔
کل لالہ، قاضی صاحب کے ہمراہ اوپری چوہارے تک چلے آئے۔ جن اور ورثہ نے دلہن بی بی شاہ بانو کو لون کی آمد

کی اطلاع دی۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور وقت تقم کیا۔ پارے سائے جلتے ہوئے شعلوں کے پس منظر میں مرشد حسین سید ایک زندہ حقیقت بن کر کھڑا تھا۔
ہاں وہ بالکل سائے ہی تو تھا۔ صبح و سلامت۔ شاہ بانو دیکھتی رہ گئی۔ ہزاروں لاکھوں آسمانی بجلیاں کوندیں۔ نیچے بے تحاشا شور تھا اور لوگ فنکارہ اس علاقے کا مشہور گیت گاتے ہوئے اپنی ہی دھن میں نغمہ سرا تھی۔

بجلی دا چوڑا چڑھائی دے دے
میری اک داری رنج لوائی دے دے
بجلی دا چوڑا چڑھائی دے دے
میری دعا چنیاں اک داری دے
تیری سر جانے نمبر داری دے
بجلی دا چوڑا چڑھائی دے دے
میرے گورے ہتھال دی مندی دے
تنوں ترلے پلایا کیندی دے
بجلی دا چوڑا چڑھائی دے دے

چمن چمن کی آواز کے ساتھ شاہ بانو کی کلائیوں میں پٹنایا گیا چوڑا بول اٹھا۔

”مرشد حسین! تم لوٹ آئے؟ میرے جذبے سے بچے تھے۔ میری وقایع امر تھیں۔“ اس کی آنکھیں آسمان کو چھو لینے کی تمنا کرنے والے شعلوں کے پار جم گئیں۔ مرشد حسین کی آنکھیں کھری تھیں۔

”بھی بھئی۔ زندگی میں کوئی سیجا بھی محبوب بن جاتا ہے۔“
کل لالہ اجازت لے کر قاضی صاحب کے ساتھ اندر آگئے۔

اب انتخاب اور قبولیت کا لمحہ قریب آچکا تھا۔
قاضی صاحب نے قبولیت کے لیے شاہ بانو کو پکارا اور جلتے شعلوں کے اس پار دھکتی آنکھوں کے ساتھ کانپتے ہوئے لبوں نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔“

کل لالہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

شاید ہی نہیں بلکہ یقیناً قیامت کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ شاہ بانو کی درگاہ کے دروہو وار اور زبان کے درمیان اس ایک چھوٹے سے لفظ ”نہیں“ نے سب ہی بدل ڈالا۔
شاید وہ اپنی ہی ذات کی نفی کر رہی تھی۔
بتول بی بی حیران و پریشان رہ گئیں۔

شاہ بانو کے ڈیرے پر انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ شاہ ہمالی آنسو پونچھتی رہ گئیں۔ جمال شاہ لالہ کے عتاب کا اندازہ کرتے ہوئے خوف زدہ ہو گیا اور بقا محمد فرار کی راہیں تلاش کرنے لگا۔ شعلوں کے پس منظر میں مرشد حسین سید زندگی کی راہیں بدلنے چلا آیا تھا اور نیچے پھیلی ہوئی کھائی سے مانی کی درگاہ تک ہر شے چارہ ہی تھی۔

”نہیں۔ نہیں۔“ ہمیں اپنے دل سے زیادہ اور اپنی آرزوؤں کے خوابوں سے الگ کوئی بھی جہان قبول نہیں۔“ دلہن بی بی شاہ بانو کے اس انکار کی خبر نیچے پنڈال تک پہنچی اور محفل کا رنگ بدل گیا۔ شاہ بابر کے دوست اسلحہ ہاتھوں میں لیے ہوئے اس بات کے خطرہ سمجھتے تھے کہ اس مقدس عمل کی تکمیل ہو تو وہ زبردست ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے جشن منا کرے یا یاں خوشی کا اظہار کر سکیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول

- دل چاہوں کہ بستی — عجب مہمان — 400p.
- بڑے توجہ سے لکھنے — نہایت — 150p.
- وہ سب سے دھانی — نہایت — 400p.
- فتنہ ہوا — نہایت — 350p.
- اپنی امید اور محبت — نہایت — 100p.
- خواتین کا گھر — نہایت — 600p.

خواتین کی ساری آواز، خواتین کی ساری آواز، خواتین کی ساری آواز

شائع ہوئے ہیں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، نمبر بازار

- لاہور کی سب سے
- شہزاد لیون راجیسی
- عظیم راجیسی سنز
- اسلام آباد کتب خانہ

راولپنڈی کی سب سے
اشرف ہیک (ایجنسی)
مہبران نیوز ایجنسی

مکروشی کا یہ اظہار رنج و غم میں بدل گیا۔

وحشت اور جنون کے ایک عالم میں شاہ بابر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ اس کی توہین تھی، ایک زبردست توہین۔ اس طرح ٹھکرائے جانے کا یہ عمل اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ تو کشمیر کے غم میں پہلے سے ہی بے چین تھا، بے قرار تھا کہ اس اچانک انقلاب نے اس کے اندر آگ لگا دی۔ کشمیر! جو اس کی چاہت تھی، محبت تھی، بنا کچھ کے، بڑی خاموشی کے ساتھ اس کی زندگی سے نکل گئی تھی اور وہ جسے اپنی زندگی میں شامل کرنے جا رہا تھا، اس نے اسے شرف قبولیت بخشے، قطعی طور پر انکار کر دیا تھا۔

یہ شاہ بابر کی ذات کی بڑی زبردست توہین تھی۔ زندگی میں آنے والی دونوں عورتوں نے اسے ٹھکرایا تھا۔ اس پر واضح کر دیا تھا کہ ظلم و زبردستی مرد کا ہتھیار ہی سہی، لیکن وہ ان ہتھیاروں کے زور پر زندگی کی جنگ نہیں جیت سکتا۔ اسے ہارنا ہی ہوتا ہے، اس لیے کہ جنگ ہمیشہ جذبول سے جیتی جاتی ہے، ہتھیاروں سے نہیں۔

غیظ و غضب کے عالم میں چلائے ہوئے شاہ لالہ اوپری چوہارے تک آگئے۔ نور محمد ہموال حالات کا آدرش پاتے

ہی بھاگ کر لنگر خانے کی طرف چلا گیا تاکہ مرشد حسین سید کو اپنی پناہ میں لے سکے۔

”سید صاحب“ اس نے پکارا۔ اب آپ یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ خدا را میرے ساتھ ہر خانے میں چلیں، ورنہ۔۔۔ اس ”ورنہ“ سے آگے ہموال کی آواز خاموش ہو گئی۔ مرشد حسین سید نے ان کی طرف دیکھا مگر خاموش کھڑا رہا۔

”سید صاحب!“ اس نے ہمت کرتے ہوئے دوبارہ آواز دی۔

”آپ کو خدا کا واسطہ۔ اس منظر سے ہٹ جائیے۔“ لیکن وہ۔۔۔ اس منظر سے نہ ہٹ سکا۔

خاموش کھڑے چوہارے کی طرف دیکھتا رہا، جہاں وہ بس بنی شاہ بانو کا وجود مل رہا تھا۔

نیچے پنڈال میں سہل بدل چکا تھا۔ شفی اور بقا محمد شاہ بابر کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں غمگین ہو چکے تھے۔

شاہ بابر انسانی وحشت کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ہاتھوں میں اسفندیار سے چھپی گئی ہندو کا رخ مرشد

حسین سید کی طرف ہو گیا۔

وہ سب کچھ جانتا تھا، بے خبر تھا تو فقط اپنی ذات سے جو ایک بے چین رشتہ سمیٹے ہوئے درگاہ شریف کا سکون تہہ وبالا کرنے کے درپے تھی۔

اوپری چوہارے پر مکمل خاموشی تھی اور نیچے پنڈال میں ایک حشر پاتا تھا۔

گل لالہ انسانیت کے واسطے دیتے رہ گئے اور شاہ بابر نے شاہ لالہ کی شہرہ پر نور محمد ہموال کو مرشد حسین سید کے وجود کو تحفظ دینے کے جرم میں ایک طرف گراتے ہوئے ساری گولیاں مرشد حسین سید کے خاموش وجود کے اندر اتار دیں۔

وہ گر گیا اور لال سرخ لہو اس سرزمین کو سیراب کر گیا۔ اس نے کچھ نہ کیا۔ جس خاموشی سے اس سرزمین پر آیا تھا، اسی خاموشی سے اپنی جان کا نذرانہ دے کر پلٹ گیا۔ کرام برپا ہو گیا۔

اوپری حویلی میں شاہ ہمالی کے جین چلائے رہے۔ ”وہ تو مقدر کا ولی تھا، تم نے اسے مار ڈالا۔ شاہ بابر یا اور رکھنا، رب کی ذات تجھے کبھی نہیں بخشے گی۔“

اپنی ذات سے بیگانہ شاہ بانو خالی نظروں سے یہاں سے وہاں تک دیکھتی رہی۔ نور محمد ہموال کہہ رہا تھا۔

”وہ چلا گیا ہے بی بی! ہم سے مایوس ہو کر اب امن اور سلامتی کا کوئی بھی راستہ اسے واپس نہ لاسکے گا۔“ شاہ بانو کے ڈیرے پر اندھیرا چھا گیا۔

سیاہ گمراہ اندھیرا۔ شاہ بانو نے نظریں اوپر اٹھائیں۔

چوہارے کے اس پار سامنے چلتے ہوئے شعلے بجھ چکے تھے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا اور گرم راکھ پر مرشد حسین سید کے دل کی تمام آرزوئیں سوئی پڑی تھیں۔

ساک کا لال سرخ جوڑا مورنگ ہو چکا تھا۔ شاہ بانو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رات۔۔۔ سرد تاریک اور گہری ہو چکی تھی۔ ہر طرف کچھ تھا، لالہ تھا، رنج و غم تھا۔

اور۔۔۔ دکھوں، غموں اور ملال کی اس دنیا پر چھائی ہوئی جائزے کی چاندنی بھی بالآخر کمری خیند سوچ گئی تھی۔